تازیانے

تازیانے

مرتبہ

الطاف مشہدی

پبلشرز

لاجپت رائے اینڈ سنز تاجران کتب لاہور

عنوان

تعداد ۷۵۰
بارِ دوم سنہ ۱۹۴۵ء

باہتمام پرنٹر پبلشر سوم پرکاش ساہنی برائے لاجپت رائے اینڈ سنز لاہور
مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپی

انتساب

بیگم صاحبہ (مرحومہ) حکیم نیرؔ واسطی مدظلہٗ

کے نام

الطاف مشہدی

فہرست

اظہارِ تشکّر

میں شروع سے "ادب برائے ادب" کا مخالف اور "ادب برائے زندگی" کا حامی رہا ہوں۔ اور میری شاعری سے بھی زیادہ تر اسی جذبہ کا اظہار ہوتا ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس روح فرسا ماحول اور مظلوم کُش نظام میں وہی ادب ادب کہلانے کا مستحق ہے۔ جو زندگی کی صحیح ترجمانی کرے۔ جو مُردوں کی مُردہ رگوں میں بجلیوں سے تیز اور آگ سے زیادہ حرارت رکھنے والا خون پیدا کرے۔ جو مظلوموں کی زبانوں میں پڑے ہوئے زنگ آلود تالوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ اور جو غریبوں کے کانوں میں بآوازِ بلند کہے۔ کہ تم بھی انسان ہو۔ قدرت کے عطیوں میں تمہارا بھی برابر کا حصّہ ہے۔

میں اُس ادب کو ہرگز صحیح ادب سمجھنے پر تیار نہیں۔ جو سرمایہ داروں کی تعیش پسند طبیعتوں کو بہلانے کے لئے معرضِ وجود میں آیا ہو۔ جو محکوموں کی توجہ اُنکے عبرتناک حالات سے ہٹا کر زلف و رخسار کی طرف منعطف کر دے۔ میرے نزدیک ایسا ادب محض "بھلاوہ" ہے میں ایسے ادب کو ہندوستانی تصنیفات میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ جو سماج کے بھیانک چہرے کو بے نقاب کر دے۔ اور بوڑھے دماغوں کی

قائم کی ہوئی قیود کی اینٹ سے اینٹ بجا دے۔ یوں تو ہمارے تھکے ہوئے دماغ سینما ہال میں جا کر بھی تھوڑی دیر کیلئے آلام و افکار کو بھول جاتے ہیں۔ شراب خانوں میں بھی کچھ لمحات عیش و عشرت میں بسر ہو سکتے ہیں۔ لیکن دیکھنا تو یہ ہے۔ کہ ہماری زندگیوں کو مستقل طور پر آرام اور سکون سے دوچار کرتے ہیں کونسا ادب ممد و معاون ثابت ہو سکتا ہے تو بلاشبہ وہ ادب "ادب برائے زندگی" ہے۔

ایک مدت سے میری خواہش تھی۔ کہ ترقی پسند ادیبوں کی کہانیوں کا ایک ایسا مجموعہ ملک کے سامنے رکھوں جو صحیح معنوں میں "ادب برائے زندگی" کا آئینہ دار ہو۔ اور آج شاید میری وہ دیرینہ خواہش پوری ہو رہی ہے۔ اس کٹھن منزل کو طے کرنے میں جن عزیزوں نے مجھے مدد دی ہے۔ اُن میں سے بعض کے نام شکریہ کیساتھ ذیل میں درج کرتا ہوں:۔

کرشن چندر ایم۔ اے۔ احمد ندیم قاسمی۔ حسن عباس۔ محمد امین صاحب

نشتر قیپوری وغیرہ۔

۲۰۔ دسمبر ۱۹۴۰ء

الطاف مشہدی

فیض باغ لاہور

شطرنج کی بازی

منشی پریم چند

نواب واجد علیشاہ کا زمانہ تھا۔ لکھنؤ، عیش و عشرت کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ چھوٹے بڑے، امیر و غریب سبھی رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ کہیں نشاط کی محفلیں آراستہ تھیں۔ تو کوئی افیون کی پینک کے مزے لیتا تھا۔ زندگی کے ہر ایک شعبہ میں رندی و مستی کا زور تھا۔ اُمورِ سیاست میں، شعر و سخن میں، طرزِ معاشرت میں، حرفت و صنعت میں، تجارت و تبادلہ میں، سبھی جگہ نفس پرستی کی دہائی تھی۔ ارکانِ سلطنت مے خواری کے غلام ہو رہے تھے، شعرا بوسہ و کنار میں مست، اہلِ حرفہ کلابتو اور چکن بنانے میں محو، اہلِ سیف تیتر بازی میں مگن۔ اہلِ روزگار سرمہ و مسی، عطر و تیل کی خرید و فروخت کے دلدادہ۔ غرض سارا ملک نفس پروری کی بیڑیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ سب کی آنکھوں میں ساغر و جام کا نشہ چھایا ہوا تھا۔ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ علم و حکمت کن کن ایجادوں میں مصروف ہے۔ بر و بحر پر مغربی اقوام کس طرح حاوی ہوتی جاتی ہیں۔ اسکی کسی کو خبر نہ تھی۔ بٹیر لڑ رہے ہیں۔ تیتروں میں پالیاں ہو رہی ہیں کہیں چوسر ہو رہی ہے۔ پو بارہ کا شور مچا ہوا ہے۔ کہیں شطرنج کے معرکے چھڑے ہوئے ہیں۔ فوجیں زیر و زبر ہو رہی ہیں۔ نواب کا حال اس سے بھی بدتر تھا۔ وہاں گتوں اور تالوں کی ایجاد ہوتی تھی۔ حظِ نفس کے نئے نئے ٹٹکے۔ نئے نئے نسخے سوچے

جانتے تھے۔ یہاں تک کہ فقرا خیرات کے پیسے پاتے تو روٹیاں خریدنے کی بجائے
مدک اور چانڈو کے مزے لیتے تھے۔ رئیس زادے حاضر جوابی اور بذلہ سنجی کی
تعلیم حاصل کرنے کے لئے ارباب نشاط سے تلمذ کرتے تھے۔ فکر کو جولاں، عقل کو رسا اور
ذہن کو تیز کرنے کے لئے شطرنج کیمیا سمجھا جاتا تھا۔ اب بھی اس قوم کے لوگ کہیں کہیں
موجود ہیں۔ جو اس دلیل کو بڑے شد و مد سے پیش کرتے ہیں۔ اسلئے اگر مرزا سجاد علی
اور میر روشن علی اپنی زندگی کا بیشتر حصہ عقل کو تیز کرنے میں صرف کیا کرتے تھے تو کسی
ذی فہم کو اعتراض کرنے کا موقع نہ تھا۔ ہاں جہلا انہیں جو چاہیں سمجھیں، دونوں
صاحبوں کے پاس موروثی جاگیریں تھیں۔ فکر معاش سے آزاد تھے، آخر اور کرتے ہی
کیا۔ طلوع سحر ہوتے ہی دونوں صاحب ناشتہ کر کے بساط پر بیٹھ جاتے۔ مہرے بچھا لیتے
اور عقل کو تیز کرنا شروع کر دیتے۔ پھر انہیں خبر نہ ہوتی تھی۔ کہ کب دوپہر ہوا، کب
سہ پہر، کب شام، گھر میں سے بار بار آدمی آ کر کہتا۔ کھانا تیار ہے۔ یہاں سے جواب
ملتا تھا۔ چلو آتے ہیں۔ دسترخوان بچھاؤ۔ مگر شطرنج کے سامنے قورمے اور پلاؤ
کے مزے بھی پھیکے تھے۔ یہاں تک کہ باورچی مجبور ہو کر کھانا کمرے میں ہی رکھ جاتا
تھا اور دونوں دوست دونوں کام ساتھ ساتھ کر کے اپنی باریک نظری کا ثبوت
دیتے تھے۔ کبھی کبھی کھانا رکھا ہی رہ جاتا۔ اسکی یاد ہی نہ آتی تھی۔ مرزا سجاد علی کے
مکان میں کوئی بڑا بوڑھا نہ تھا۔ اسلئے انہیں کے دیوان خانے میں معرکہ آرائیاں
ہوتی تھیں۔ مگر اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ مرزا کے گھر کے اور لوگ اس مشغلہ سے خوش
تھے، ہرگز نہیں۔ محلہ کے گھر کے نوکر چاکر دل میں۔ مہریوں، ماماؤں، ایلیں، بڑا حاسدانہ
حرف گیریاں ہوتی رہتی تھیں۔ بڑا منحوس کھیل ہے، گھر کو تباہ کر کے چھوڑتا ہے۔ خدا

نہ کرے کوئی کو اسکی چاٹ پڑے۔ آدمی نہ دین کے کام کا رہتا ہے۔ نہ دنیا کے کام کا۔ بس اسے دھوبی کا کُتا سمجھو۔ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ بُرا مرض ہے۔ ستم یہ تھا کہ بیگم صاحبہ بھی آئے دن اس مشغلہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی رہتی تھیں تب مرزاجی گھر میں آتے تھے۔ ہاں جولاہے کا غصہ داڑھی پر اُتارا کرتی تھیں نوکروں کو جھڑکیاں دیا کرتیں۔ کیا میاں نے پان مانگے ہیں؟ کہہ دو آکر لیجائیں۔ کیا پاؤں میں مہندی لگی ہوئی ہے۔ کیا کہا ابھی کھانے کی فرصت نہیں ہے؟ کھانا لیجا کر سر پر پٹک دو۔ کھائیں یا کتوں کو کھلائیں۔ یہاں انکے انتظار میں کون بیٹھا رہے گا۔ مگر لطف یہ ہے کہ انہیں اپنے میاں سے اتنی شکایت نہ تھی جتنی میر صاحب سے وہ میر صاحب کو نکھٹو، بگاڑو، ٹکڑے خور وغیرہ ناموں سے یاد کرتی تھیں۔ شاید مرزاجی بھی اپنی بریت کے اظہار میں سارا الزام میر صاحب ہی کے سر ڈال دیتے تھے۔

ایک دن بیگم صاحبہ کے سر میں درد ہونے لگا۔ تو ماما سے کہا جا کر مرزاجی کو بُلا لا۔ کسی حکیم کو بُلائیں۔ دوڑ جلدی کر۔ سر پھٹا جاتا ہے۔ ماما گئی تو مرزاجی نے کہا۔ چل ابھی آتے ہیں۔ بیگم صاحبہ کو اتنی تاب کہاں کہ انکے سر میں درد ہو اور میاں شطرنج کھیلنے میں مصروف ہوں۔ چہرہ سرخ ہو گیا اور ماما سے کہا جا کر کہہ کہ ابھی چلئے۔ ورنہ وہ خود حکیم صاحب کے یہاں چلی جائیں گی۔ کچھ انکے آنکھوں راستہ نہیں دیکھا ہے۔ مرزاجی بڑی دلچسپ بازی کھیل رہے تھے۔ دو ہی کشتوں میں میر صاحب کی مات ہوئی جاتی تھی، بولے کیا ایسا دم لبوں پر ہے۔ ذرا صبر نہیں آتا حکیم صاحب چھُو منتر کر دیں گے۔ کہ انکے آتے ہی آتے درد سر رفع ہو جائے گا۔

میر صاحب نے فرمایا ”اے تو جا کر ذرا اُن ہی آ بیٹے نہ! عورتیں نازک مزاج ہوتی ہی ہیں“۔

مرزا ”جی ہاں کیوں نہ چلا جاؤں۔ دو کشتوں میں آپ کی مات ہوتی ہے!“

میر ”جی اس بھروسے نہ رہیئے گا۔ وہ چال سوچی ہے کہ آپ کے مہرے دھرے رہیں اور مات ہو جائے۔ پر جائیے سُن آئیے۔ کیوں خواہ مخواہ ذرا سی بات کے لئے ان کا دل دکھائیے گا؟“

مرزا ”جی چاہتا ہے اسی بات پر مات کر دوں“۔

میر ”میں کھیلوں گا ہی نہیں۔ آپ پہلے جا کر سُن آئیں“۔

مرزا ”اے یار جانا پڑے گا حکیم کے یہاں۔ درد و رد خاک نہیں ہے۔ مجھے دق کرنے کا حیلہ ہے“۔

میر ”کچھ بھی ہو انکی خاطر کرنی ہی پڑے گی“۔

مرزا ”اچھا ایک چال اور چل لوں“۔

میر ”ہرگز نہیں۔ جب تک آپ سُن نہ آئیں گے۔ میں مہروں کو ہاتھ نہ لگاؤں گا!“

مرزا صاحب مجبور ہو کر اندر گئے تو بیگم صاحبہ نے کراہتے ہوئے کہا ”تمہیں نگوڑا شطرنج اتنا پیارا ہے۔ کہ چاہے کوئی مر بھی جائے۔ پر اُٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ شطرنج ہے کہ میری سوکن ہے۔ تو ج کوئی تم جیسا نہ ہو ہیا ہو“۔

مرزا ”کیا کروں۔ میر صاحب مانتے ہی نہ تھے۔ بڑی مشکلوں سے گلا چھڑا کر آیا ہوں!“

بیگم ”کیا جیسے خود نکھٹو ہیں۔ ویسے ہی دوسروں کو سمجھتے ہیں۔ ان کے بھی تو بال

بچے ہیں۔ کہ سب کا صفایا کر دیا۔"

مرزا۔" بڑا لتی آدمی ہے۔ جب آ کر سر پر سوار ہو جاتا ہے۔ تو مجبور ہو کر مجھے بھی کھیلنا ہی پڑتا ہے۔"

بیگم۔" دُھتکار کیوں نہیں دیتے کتّے کی طرح۔"

مرزا۔" سبحان اللہ۔ برابر کے آدمی ہیں۔ عمر میں رُتبہ میں مجھ سے دو اُنگل اونچے ملاحظہ کرنا ہی پڑتا ہے۔"

بیگم۔ تو میں ہی دُھتکارے دیتی ہوں۔ ناراض ہو جائیں گے ہو جائیں۔ کون میری روٹیاں چلاتے ہیں۔ رانی روٹھیں گی۔ اپنا سہاگ لیں گی۔ (ماما سے) عباسی شطرنج اُٹھا لا۔ میر صاحب سے کہہ دینا۔ میاں اب نہ کھیلیں گے۔ آپ تشریف لیجائیں۔ اب پھر منہ نہ دکھائیے گا۔"

مرزا۔" ہائیں ہائیں۔ کہیں ایسا غضب نہ کرنا۔ کیا ذلیل کرو گی کیا۔ ٹھہر عباسی کمبخت کہاں دوڑی جاتی ہے۔"

بیگم۔" جانے کیوں نہیں دیتے، میرا ہی خون پئے جو روکے، اچھا اسے روک لیا۔ مجھے روکو تو جانوں۔ یہ کہکر بیگم صاحبہ خود جھلّائی ہوئی دیوان خانہ کی طرف چلیں مرزا جی کا چہرہ فق ہو گیا۔ ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ بیوی کی منتیں کرنے لگے۔ خدا کے لئے تمہیں شہید کربلا کی قسم۔ میری ہی میت دیکھے۔ جو اُدھر قدم رکھے۔ لیکن بیگم صاحبہ نے ایک نہ مانی۔ دیوان خانہ کے دروازہ تک گئیں۔ یکایک نامحرم کے روبرو بے نقاب جاتے ہوئے پیر رُک گئے۔ وہیں سے اندر کی طرف جھانکا۔ حُسنِ اتفاق سے کمرہ خالی تھا۔ میر صاحب نے حسبِ ضرورت دو چار مہرے تبدیل کر دیئے تھے۔ وہ اسوقت اپنی

صفائی جتانے کے لئے باہر چبوترہ پہ چہل قدمی کر رہے تھے۔ پھر کیا تھا بیگم صاحبہ کو منہ مانگی مراد ملی۔ اندر پہنچکر بازی اُلٹ دی۔ مہرے کچھ تخت کے نیچے پھینکے کچھ باہر، تب دروازہ اندر سے بند کر کے کنڈی لگا دی۔ میر صاحب دروازے پر تو تھے ہی۔ مہرے باہر پھینکے جاتے دیکھے پھر چوڑیوں کی جھنکار سُنی تو سمجھ گئے۔ بیگم صاحبہ بگڑ گئیں۔ چپکے سے گھر کی راہ لی۔

مرزا نے بیگم صاحبہ سے کہا "تم نے غضب کر دیا"۔

بیگم "اب موا ادھر آئے تو کھڑے کھڑے نکال دوں۔ گھر نہیں چکلہ سمجھ لیا ہے اتنی لو اگر خدا سے لگاتے تو ولی ہو جاتے۔ آپ لوگ تو شطرنج کھیلیں میں یہاں چولھے چکی میں سر کھپاؤں۔ لونڈی سمجھ رکھا ہے۔ جاتے ہو حکیم صاحب کے یہاں کہ اب بھی تامل ہے"۔

مرزا جی گھر سے نکلے تو حکیم صاحب کے یہاں بدلے میر صاحب کے گھر پہنچے۔ تو (معذرت آمیز لہجہ میں) بادل پُر درد سارا ماجرا کہہ سنایا۔

میر صاحب ہنسکر بولے "اتنا تو میں اُسی وقت سمجھ گیا تھا۔ جب دربر کا پیغام ماما لائی تھی۔ کہ آج آثار اچھے نہیں ہیں۔ مگر بڑی غصہ ور معلوم ہوتی ہیں۔ اُف! اتنی تمکنت! آپنے انہیں بہت سر چڑھا رکھا ہے۔ یہ مناسب نہیں۔ اُنہیں اس سے کیا مطلب کہ آپ باہر کیا کرتے ہیں۔ خانہ داری کا انتظام کرنا ان کا کام ہے مردوں کی باتوں میں دخل دینے کا انہیں کیا مجاز! میرے یہاں دیکھئے کبھی کوئی چوں بھی نہیں کرتا"۔

مرزا "خیر یہ تو بتائیے اب کہاں جماؤ ہوگا؟"

میر:۔ "اسکا کیا غم ہے۔ اتنا بڑا گھر پڑا ہوا ہے۔ بس یہیں جمے گی۔"

مرزا:۔ "لیکن بیگم صاحبہ کو کیسے مناؤنگا۔ جب گھر پر بیٹھا رہتا تھا۔ تب تو اتنی خفگی تھی۔ گھر سے چلا آؤں تو شاید زندہ نہ چھوڑیں۔"

میر:۔ "اجی بکنے دیجئے۔ دو چار دن میں خود بخود سیدھی ہو جائیں گی۔ ہاں آپ بھی ذرا تن جائیے۔"

(۲)

میر صاحب کی بیگم صاحبہ کسی وجہ سے میر صاحب کے گھر سے غائب رہنا ہی پسند کرتی تھیں۔ اسلئے وہ انکے مشغلہ تفریح کا مطلق گلہ نہ کرتی تھیں۔ بلکہ کبھی کبھی انہیں جانے میں دیر ہو جاتی۔ یا کچھ السا تے۔ تو سر دو بہ مستاں یا دو ہانیہ ان کے مصداق انہیں آگاہ کر دیا کرتی تھیں۔ ان وجوہ سے میر صاحب کو گمان ہو گیا تھا۔ کہ میری بیگم صاحبہ نہایت خلیق۔ متحمل مزاج اور عفت کیش ہیں۔ لیکن جب انکے دیوان خانہ میں بساط بچھنے لگی اور میر صاحب کی دائمی موجودگی سے بیگم صاحبہ کی آزادی میں ہرج واقع ہونے لگا۔ تو انہیں بڑی تشویش دامنگیر ہوئی۔ دن کے دن دروازہ پر جھانکنے کو بھی ترس جاتی تھیں سوچنے لگیں۔ کیونکہ یہ بلا سر سے ٹلے۔

ادھر نوکروں میں بھی کانا پھوسی ہونے لگی۔ اب تک دن بھر پڑے پڑے تماشے لیتے تھے۔ گھر میں کوئی آئے کوئی جائے۔ ان سے مطلب نہ تھا نہ سروکار۔ مشکل سے دو چار دفعہ بازار جانا پڑتا۔ اب آٹھوں پہر کی دھونس ہو گئی۔ کبھی پان لگانے کا حکم ہوتا کبھی پانی لانے کا کبھی برف لانے کا۔ کبھی تمباکو بھرنے کا۔ حقہ تو کسی دل جلے عاشق کی طرح ہر دم گرم رہتا تھا۔ سب جا کر بیگم صاحبہ سے کہتے۔ حضور میاں کا شطرنج

تو ہمارے جی کا جنجال ہو گیا۔ دن بھر دوڑتے دوڑتے پیروں میں چھالے پڑ جاتے ہیں۔ یہ بھی کوئی کھیل ہے کہ صبح کو بیٹھے تو شام کر دی۔ گھڑی دو گھڑی کھیل لیا، چھٹی ہوئی اور پھر حضور تو جانتے ہیں کہ کتنا منحوس کھیل ہے۔ جسے اسکی چاٹ پڑ جاتی ہے کبھی نہیں پنپتا۔ گھر پر کوئی نہ کوئی آفت ضرور آتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک کے پیچھے محلے کے محلے تباہ ہوتے دیکھے گئے ہیں محلہ والے ہر دم ہمیں لوگوں کو ٹوکا کرتے ہیں شرم سے گڑ جانا پڑتا ہے۔ بیگم صاحبہ کہیں مجھے تو یہ کھیل خود ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ پر کیا کروں؟ میرا کیا بس ہے؟

محلہ میں دو چار بڑے بوڑھے آدمی تھے۔ وہ طرح طرح کی بدگمانیاں کرنے لگے۔ اب خیریت نہیں ہے۔ جب ہمارے رئیسوں کا یہ حال ہے۔ تو ملک کا خدا ہی حافظ ہے یہ سلطنت شطرنج کے ہاتھوں تباہ ہو گی۔ لچھن برے ہیں۔

ملک میں واویلا مچا ہوا تھا۔ رعایا دن دہاڑے لٹتی تھی۔ پر کوئی اسکی فریاد سننے والا نہ تھا۔ دیہاتوں کی ساری دولت لکھنؤ میں کھنچی چلی آتی تھی۔ اور یہاں سامان عیش کے بہم پہنچانے میں صرف ہو جاتی تھی۔ بھانڈ، نقال، کتھک، ارباب نشاط کی گرم بازاری تھی۔ ساقیوں کی دکانوں پر اشرفیاں برستی تھیں۔ رئیس زادے ایک ایک دم کی ایک ایک اشرفی پھینک دیتے تھے۔ مصارف کا یہ حال اور انگریزی کمپنی کا قرضہ روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ اس کی ادائیگی کی فکر کسی کو نہ تھی یہاں تک سالانہ خراج بھی ادا نہ ہو سکتا تھا۔ رزیڈنٹ بار بار تاکیدی خطوط لکھتا۔ دھمکیاں دیتا مگر یہاں لوگوں پر نفس پروری کا نشہ سوار تھا۔ کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگتی تھی۔

خیر میر صاحب کے دیوان خانے میں شطرنج ہوتے کئی مہینے گزر گئے۔ نت نئے نئے نقشے حل کئے جاتے، نئے نئے قلعے تعمیر ہوتے اور مسمار کئے جاتے۔ کبھی کبھی کھیلتے کھیلتے آپس میں جھڑپ ہو جاتی۔ تو تو میں میں کی نوبت پہنچ جاتی۔ پر یہ شکر رنجیاں بہت جلد دفع ہو جاتی تھیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ مرزا جی اٹھ کر اپنے گھر چلے جاتے۔ میر صاحب بساط اٹھا کر اپنے گھر میں آ بیٹھتے۔ اور قسمیں کھاتے کہ اب کبھی شطرنج کے نزدیک نہ جائیں گے۔ مگر صبح ہوتے ہی دونوں دوست پھر مل بیٹھتے۔ نیند ساری بدمزگیوں کو دور کر دیتی تھی۔

ایک دن دونوں احباب بیٹھے شطرنج کے دلدل میں غوطے کھا رہے تھے کہ شاہی رسالہ کا ایک سوار وردی پہنے اسلحہ سے لیس میر صاحب کا نام پوچھتا آ پہنچا میر صاحب کے ہوش اُڑ گئے۔ اوسان خطا ہو گئے۔ خدا جانے کیا بلا سر پر آئی۔ گھر کے دروازے بند کر لئے اور نوکروں سے کہا۔ کہدو۔ گھر میں نہیں ہیں۔

سوار نے پوچھا۔ گھر میں نہیں ہیں تو کہاں ہیں۔ کہیں چھپے بیٹھے ہونگے،،

خدمتگار۔ یہ میں نہیں جانتا۔ گھر میں سے یہی جواب ملا ہے۔ کیا کام ہے ؟

سوار۔ کام تجھے کیا بتاؤں۔ حضور میں طلبی ہے۔ شاید فوج کے لئے کچھ سپاہی مانگے گئے ہیں۔ جاگیردار ہیں کہ مذاق ہے۔

خدمتگار۔ اچھا تشریف لے جائیے۔ کہدیا جائیگا۔

سوار۔ کہنے سننے کی بات نہیں ہے۔ میں کل فوراً آؤنگا اور تلاش کر کے لیجاؤنگا۔ اپنے ہمراہ حاضر کرنے کا حکم ہوا ہے۔

سوار تو چلا گیا۔ میر صاحب کی روح فنا ہو گئی۔ کانپتے ہوئے مرزا جی بولے۔

اب کیا ہو گا؟"

مرزا "بڑی مصیبت ہے۔ کہیں میری طلبی بھی نہ ہو"

میر "کمبخت کل پھر آنے کو کہہ گیا ہے"

مرزا "قہر آسمانی ہے۔ اور کیا۔ کہیں سپاہیوں کی مانگ ہوئی تو بن موت مرے۔ یہاں تو جنگ کا نام سنتے ہی جوڑی چڑھ آتی ہے"

میر "یہاں تو آج سے دانہ پانی حرام سمجھیئے"

مرزا "بس یہی تدبیر ہے کہ اس سے ملیئے ہی نہیں۔ دونوں آدمی غائب ہو جائیں۔ سارا شہر چھانتا پھرے۔ کل سے گومتی پار کسی ویرانے میں نقشہ جمے۔ وہاں کسے خبر ہو گی۔ حضرت اپنا سا منہ لیکر لوٹ جائیں گے"

میر "بس بس آپ کو خوب سوجھی۔ واللہ کل سے گومتی پار کی ٹھیرے"

اِدھر بیگم صاحبہ سوار سے کہہ رہی تھیں۔ تم نے خوب بہروپ بھرا۔ اُس نے جواب دیا۔ ایسے گاؤدیوں کو تو چٹکیوں پر نچاتا ہوں۔ اُس کی ساری عقل اور ہمت تو شطرنج نے چر لی۔ اب دیکھ لینا جو کبھی بھول کر بھی گھر رہے صبح کا گیا پھر رات کو آئے گا۔

(۳)

اُس دن سے دونوں دوست منہ اندھیرے گھر سے نکل کھڑے ہوتے۔ اور بغل میں ایک چھوٹی سی دری دبائے ڈبے میں گلوریاں بھرے، گومتی پار ایک پرانی ویران مسجد میں جا بیٹھتے۔ جو شاید عہد مغلیہ کی یادگار تھی۔ راستہ میں چلم، تمباکو، مدریا لے لیتے اور مسجد میں پہنچ، دری بچھا، حقہ بھر کر بساط پر جا بیٹھتے۔ پھر انہیں دین و دنیا کی فکر

نہ رہتی تھی۔ کشتِ شہ پیٹ لیا۔ ان الفاظ کے سوا انکے منہ سے اور کوئی کلمہ نہ نکلتا۔ کوئی چلہ کش بھی اپنے استغراق کی حالت میں نہ بیٹھتا ہوگا۔ دوپہر کو جب بھوک معلوم ہوتی تو دونوں حضرت گلیوں میں ہوتے ہوئے کسی نان بائی کی دکان پر کھانا کھا لیتے اور ایک چلم حقہ پی کر پھر محو شطرنج بازی۔ کبھی کبھی تو انہیں کھانے کی بھی سدھ نہ رہتی تھی۔

ادھر ملک میں سیاسی پیچیدگیاں روز بروز پیچیدہ تر ہوتی جاتی تھیں۔ کمپنی کی فوجیں لکھنؤ کی طرف بڑھی چلی آتی تھیں۔ شہر میں ہلچل مچا ہوا تھا۔ لوگ اپنے اپنے بال بچوں کو لیکر دیہاتوں میں بھاگے جا رہے تھے۔ پر ہمارے دونوں شطرنج باز دوستوں کو غمزدہ اور غم کا لا سے کوئی واسطہ نہ تھا وہ گھر سے چلتے تو گلیوں میں ہو جاتے کہیں کسی کی نگاہ نہ پڑ جائے۔ محلے والوں کو بھی انکی صورت دکھائی نہ دیتی تھی۔ یہانتک کہ انگریزی فوجیں لکھنؤ کے قریب پہنچ گئیں۔

ایک دن دونوں احباب بیٹھے بازی کھیل رہے تھے۔ میر صاحب کی بازی کچھ کمزور تھی۔ مرزا صاحب کشت پر کشت دے رہے تھے کہ دفعتاً کمپنی کی فوج سامنے سڑک پر سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ کمپنی نے لکھنؤ پر تصرف کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ قرض کی علت میں سلطنت ہضم کر لینا چاہتی تھی۔ وہی مہاجنی چال چلی جس سے آج ساری کمزور قومیں پابہ زنجیر ہو رہی ہیں۔

میر صاحب "انگریزی فوجیں آرہی ہیں"۔

مرزا "آنے دیجئے۔ کشت بچائیے۔ یہ کشت"!

میر "ذرا دیکھنا چاہیئے۔ آڑ سے دیکھیں۔ کیسے قوی ہیکل جوان ہیں۔ دیکھ کر

کسی ملک میں کسی بادشاہ کی معزولی اتنی صلح آمیز، اتنی بے ضرر نہ ہوئی ہوگی۔ کم از کم تاریخ میں اسکی نظیر نہیں ہے وہ اہنسا نہ تھی، جس پر ملائک خوش ہوتے ہیں یہ وہ پست ہمتی، وہ نامردی تھی، جس پر دیویاں روتی ہیں۔ لکھنؤ کا فرماں روا قیدی بنا چلا جاتا تھا اور لکھنؤ عیش کی نیند میں مست تھا۔ یہ سیاسی زوال کی انتہائی حد تھی۔

مرزا نے کہا "حضور عالی کو ظالموں نے قید کر لیا ہے"

میر "ہوگا آپ کوئی قاضی ہیں۔ یہ لیجئے شہ"

مرزا "حضرت ذرا ٹھہریئے اس وقت بازی کی طرف طبیعت مائل نہیں ہوتی حضور عالی خون کے آنسو روتے جاتے ہونگے۔ لکھنؤ کا چراغ آج گل ہو گیا"

میر "رویا ہی چاہیں۔ یہ عیش قید فرنگ میں کہاں میسر۔ یہ شہ"

مرزا "کسی کے دن ہمیشہ برابر نہیں جاتے۔ کتنی سخت مصیبت ہے۔ بلائے آسمانی"

میر "ہاں ہے ہی۔ پھر کشت۔ بس دوسری کشت میں مات ہے، بچ نہیں سکتے"

مرزا "آپ بڑے بے درد ہیں۔ واللہ۔ ایسا حادثہ جانکاہ دیکھ کر آپ کو صدمہ نہیں ہوتا۔ ہائے۔ حضور جان عالم کے بعد اب کمال کا کوئی قدردان نہ رہا لکھنؤ ویران ہو گیا"

میر "پہلے اپنے بادشاہ کی جان بچائیے۔ پھر حضور پرنور کا ماتم کیجئے۔ یہ کشت اور مات، لانا ہاتھ"

نواب کو لئے ہوئے فوج سامنے سے نکل گئی۔ انکے جاتے ہی مرزا جی نے پھر بازی بچھادی۔ ہار کی چوٹ بری ہوتی ہے۔ میر صاحب نے کہا۔ آئیے نواب صاحب کی

سینہ نکھر آتا ہے"۔

مرزا: "دیکھ لیجئے گا۔ کیا جلدی ہے۔ پھر کشت"۔

میر: "توپ خانہ بھی ہے۔ کوئی پانچ ہزار آدمی ہونگے۔ سُرخ چہرہ جیسے لال بندر"۔

مرزا: "جناب حیلے نہ کیجئے۔ یہ کشت"۔

میر: "آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ خیال تو کیجئے۔ شہر کا محاصرہ ہو گیا۔ تو گھر کیسے چلیں گے"۔

مرزا۔ جب گھر چلنے کا وقت آئیگا تو دیکھی جائے گی۔ یہ کشت اور مات"۔

فوج نکل گئی۔ یاروں نے دوسری بازی بچھادی۔ مرزا جی بولے آج کھانے کی کیسے رہے گی؟"

میر: "آج روزہ ہے۔ کیا آپ کو زیادہ بھوک لگی ہے؟"

مرزا: "جی نہیں۔ شہر میں نہ معلوم کیا ہو رہا ہوگا؟

میر: "شہر میں کچھ نہ ہو رہا ہوگا لوگ کھانے سے فارغ ہو کر آرام کر رہے ہونگے حضور جان عالم بھی استراحت فرماتے ہونگے۔ یا شاید ساغر کا دور چل رہا ہو"۔

اب کی دونوں دوست کھیلنے بیٹھے تو تین بج گئے۔ اب کی مرزا جی کی بازی کمزور تھی۔ اس اثنا میں فوج کی واپسی کی آہٹ ملی۔ نواب واجد علی شاہ معزول کر دیئے گئے تھے۔ اور فوج انہیں گرفتار کئے لئے جاتی تھی۔ شہر میں کوئی ہنگامہ نہ ہوا نہ کشت وخون، یہاں تک کہ کسی جانباز نے ایک قطرہ خون بھی نہ بہایا۔ نواب گھر سے اسطرح رخصت ہوئے جیسے لڑکی روتی پیٹتی سسرال جاتی ہے بیگمیں روئیں نواب روئے ماما ئیں مغلانیاں روئیں۔ اور بس سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ ازل سے

حالت زار پر ایک مرثیہ کہہ ڈالیں۔ لیکن مرزا جی کی وفاداری اور اطاعت شعاری اپنی ہار کے ساتھ غائب ہوگئی تھی۔ وہ شکست کا انتقام لینے کے لئے بے صبر ہو رہے تھے۔

(۴)

شام ہوگئی مسجد کے کھنڈر میں چمگادڑوں نے اذان دینا شروع کیا۔ ابابیلیں اپنے اپنے گھونسلوں سے چمٹ کر نماز مغرب ادا کرنے لگیں پر دونوں کھلاڑی بازی پر ڈٹے ہوئے تھے۔ گویا دو خون کے پیاسے سُورما موت کی بازی کھیل رہے ہوں مرزا جی متواتر تین بازیاں ہار چکے تھے۔ اب چوتھی بازی کا رنگ بھی اچھا نہ تھا۔ وہ بار بار جیتنے کا مستقل ارادہ کر کے خوب سنبھل سنبھل کر، طبیعت پر خوب زور دے کر کھیلتے تھے۔ لیکن ایک نہ ایک چال ایسی خراب پڑ جاتی تھی۔ کہ ساری بازی بگڑ جاتی ادھر میر صاحب غزلیں پڑھتے تھے۔ ٹھمریاں گاتے تھے۔ چٹکیاں لیتے تھے۔ آوازے کستے تھے۔ ضلع اور جگت میں کمال دکھاتے تھے۔ ایسے خوش تھے گویا کوئی دفینہ ہاتھ آگیا ہے مرزا صاحب انکی یہ خوش فعلیاں سُن سُنکر جھنجلاتے اور بار بار تیوری چڑھا کر کہتے۔ آپ چال تبدیل کیا کیجئے یہ کیا کہ چال چلے اور فوراً بدل دی۔ جو کچھ کرنا ہو ایک بار خوب غور کر کے کیجئے جناب آپ مہرے پر اُنگلی کیوں رکھتے رہتے ہیں مہرے کو بے لاگ چھوڑ دیا کیجئے جب تک دل میں چال کا فیصلہ نہ ہو جائے مہرہ کو ہاتھ نہ لگایا کیجئے حضرت آپ ایک ایک چال آدھ آدھ گھنٹے میں کیوں چلتے ہیں اسکی سند نہیں جسکی ایک چال میں پانچ منٹ سے زیادہ لگیں اسکی مات سمجھی جائے۔ پھر اُنہے چال بدلی۔ مہرہ وہیں رکھ دیجئے۔

میر صاحب کا فرزیں پٹا جاتا تھا۔ بولے "میں نے چال چلی کب تھی؟"

مرزا۔ "آپ کی چال ہو چکی ہے۔ خیریت اسی میں ہے کہ مہرہ اسی گھر میں رکھ دیجئے۔"

میر۔ "اس گھر میں کیوں رکھوں؟ میں نے اس مہرے کو ہاتھ سے چھوا کب تھا؟"

مرزا۔ "آپ قیامت تک مہرے کو نہ چھوئیں تو کیا چال ہی نہ ہوگی۔ فرزیں پٹتے دیکھا تو دھاندلی کرنے لگے۔"

میر۔ "دھاندلی آپ کرتے ہیں۔ ہار جیت تقدیر سے ہوتی ہے۔ دھاندلی کرنے سے کوئی نہیں جیتتا۔"

مرزا۔ "یہ بازی آپ کی مات ہو گئی۔"

میر۔ "میری مات کیوں ہونے لگی۔"

مرزا۔ "تو آپ مہرے اس گھر میں رکھ دیجئے۔ جہاں پہلے رکھا تھا۔"

میر۔ "وہاں کیوں رکھوں نہیں رکھتا۔"

مرزا۔ "آپ کو رکھنا پڑے گا۔"

میر۔ "ہرگز نہیں۔"

مرزا۔ "رکھیں گے تو آپکے فرشتے۔ آپ کی حقیقت ہی کیا ہے۔"

بات بڑھ گئی۔ دونوں اپنی ٹیک کے دھنی تھے۔ نہ یہ دبتا تھا۔ نہ وہ۔ تکرار میں لامحالہ غیر متعلق باتیں ہونے لگتی ہیں۔ جن کا منشا ذلیل اور خفیف کرنا ہوتا ہے مرزا جی نے فرمایا۔ "اگر خاندان میں کسی نے شطرنج کھیلا ہوتا تو آپ آئین اور قاعدے سے واقف ہوتے۔ وہ ہمیشہ گھانس چھیلا کئے۔ آپ کیا کھا کر شطرنج کھیلنے گا۔ ریاست شے دیگر ہے جاگیر مل جانے سے کوئی رئیس نہیں ہو جاتا۔"

میر: "گھانس آپکے ابا جان چھیلتے ہونگے۔ یہاں تو شطرنج کھیلتے پیڑیاں اور پشتیں گذر گئیں"۔

مرزا: "اجی جائیے! نواب غازی الدین کے یہاں۔ باورچی گری کرتے کرتے عمر گذر گئی۔ اس طفیل میں جاگیر پا گئے۔ آج رئیس بننے کا شوق چرایا ہے رئیس بننا دل لگی نہیں ہے"۔

میر: "کیوں اپنے بزرگوں کے منہ پر کالکھ لگا رہے ہو۔ وہی باورچی رہے ہونگے ہمارے بزرگ تو نواب کے دستر خوان پر بیٹھے تھے۔ ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے"۔

مرزا: "بے حیاؤں کو شرم بھی نہیں آتی"۔

میر: زبان سنبھالئے ورنہ برا ہوگا۔ یہاں ایسی باتیں سننے کے عادی نہیں ہیں کسی نے آنکھ دکھائی اور ہم نے دیا تلا ہوا ہاتھ۔ بھنڈار کھل گیا"۔

مرزا: "آپ ہمارے حوصلے دیکھیں گے۔ تو سنبھل جائیے۔ تقدیر آزمائی ہو جائے۔ اِدھر یا اُدھر"۔

میر: "ہاں آجاؤ۔ تم سے دبتا کون ہے"۔

دونوں دوستوں نے کمر سے تلواریں نکال لیں۔ اُن دنوں ادنٰی اور اعلٰی سبھی کٹار، خنجر، پیش قبض، شیر بچہ باندھتے تھے۔ دونوں عیش کے بندے تھے مگر بے غیرت نہ تھے۔ قومی دلیری ان میں عنقا تھی۔ مگر ذاتی دلیری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی انکے سیاسی جذبات فنا ہوگئے تھے۔ بادشاہ کے لئے سلطنت کے لئے قوم کے لئے کیوں مریں؟ کیوں اپنی میٹھی نیند میں خلل ڈالیں۔ مگر انفرادی جذبات میں مطلق خوف نہ تھا۔ بلکہ وہ قوی تر ہوگئے تھے۔ دونوں نے پینترے بدلے۔ بکنوٹی

اور گتھم گتھا ہوئے تھے۔ تلواریں چمکیں۔ چھپا چھپ کی آواز آئی اور دونوں زخم کھا کر گر پڑے۔ دونوں نے وہیں تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ اپنے بادشاہ کے لئے جن کی آنکھوں سے ایک بوند آنسو کی نہ گری۔ انہیں دونوں آدمیوں نے شطرنج کے وزیر کے لئے اپنی گردنیں کٹا دیں۔

اندھیرا ہو گیا تھا۔ بازی بچھی ہوئی تھی۔ دونوں بادشاہ اپنے اپنے تخت پر رونق افروز تھے۔ ان پر حسرت چھائی ہوئی تھی گویا مقتولین کی موت کا ماتم کر رہے ہیں"۔ چاروں طرف سناٹے کا عالم تھا۔ کھنڈر کی بوسیدہ دیواریں اور خستہ حال کنگرے اور سربسجود مینار ان لاشوں کو دیکھتے تھے اور انسانی زندگی کی بے ثباتی پر افسوس کرتے تھے۔ جس میں سنگ و خشت کا ثبات بھی نہیں۔

نغمے کی موت

کرشن چندر ایم۔ اے

ساگرہ کے بوڑھے نمبردار نے بارہ سال تک مرحومہ کے لڑکے کی پرورش کی۔ اس نے بکمال مہربانی لڑکے کا نام گلاب رائے رکھا۔ لیکن اگر وہ اس کا نام مہوچندر، چندرو۔ یا گھاسی رام رکھ دیتا۔ تو اُسے منع کرنے والا کون تھا۔ یہ تو اس کے شریف الطبع ہونے کی بہترین دلیل تھی کہ اس نے ایک یتیم لڑکے کی بارہ سال تک پرورش کی اور اسکا نام گلاب رائے رکھا۔ اسمیں شک نہیں کہ لڑکا گلاب کیطرح ہی خوشرنگ اور حسین تھا۔ اور اسکے چہرے اور ہاتھ کی انگلیوں میں اپنی ماں کے جمالی حسن کے بہت سے اوصاف پائے جاتے تھے۔ لیکن جیسا کہ دنیا کے ہر ایک ادیب اور شاعر نے کہا ہے کہ حسین چہرے عورتوں کو ہی زیب دیتے ہیں یا ان امیر نوجوانوں کو جنہیں زلیخاؤں کے عشق میں مرنے کے لئے ہزاروں موقعے ملتے ہوں۔ وقت بھی ہو، اور وافر پیسہ بھی ہو۔ لیکن گلاب رائے تو ایک یتیم لڑکا تھا۔ ایک غریب کسان کا بچہ۔ جس کی حیثیت گاؤں میں بوڑھے نمبردار کے ایک کمین سے بڑھ کر نہ تھی۔ غریب عورت میں خوبصورتی ہو تو بازاروں میں بک جاتی ہے۔ وہ ایک نفع دینے والی شے ہے۔ لیکن غریبوں کے بیٹوں میں خوبصورتی

ایک بیکار شے ہے۔ بلکہ اکثر مضرت رساں بھی۔ کیونکہ بازار میں نوکسان بچوں کے بازوؤں کی طاقت اور چھاتی کا زور بکتا ہے۔ اور جن کے پاس یہ دونوں چیزیں کم ہوتی ہیں، یا کم ہو جاتی ہیں اُنہیں پیٹ بھر کر روٹی نہیں مل سکتی۔ یہ سماج کا ایک سیدھا سادہ اصول ہے، جس پر غور کرنے کی چنداں ضرورت نہیں اور یہ تو گلاب رائے کی خوش قسمتی تھی۔ کہ اس کے کردار میں نسائیت کی جھلک نمایاں ہونے کے باوجود اسے دونوں وقت پیٹ بھر کر روٹی مل جاتی تھی۔

پہلے پہل جو کام اسے بوڑھے نمبردار نے سپرد کیا تھا۔ وہ چنداں مشکل بھی نہ تھا۔ اور اب جب گلاب رائے کبھی ان دنوں کو یاد کرتا۔ تو وہ اسے اپنے ماضی کے حسین ترین لمحے معلوم ہوتے۔ وہ دن کو بوڑھے نمبردار کا ریوڑ سرکاری رکھ میں لیجاتا تھا۔ جہاں گائیں بھینسیں اور بھیڑ بکریاں چرانا ایک بہت بڑا جُرم تھا۔ لیکن ساگرہ اور دیگر پہاڑی مواضع میں جو پہاڑوں کی ڈھلانوں پر آباد تھے۔ اور جہاں زمین فی کس اس قدر کم تھی کہ سال کا فصل ضرورت زندگی کا کفیل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہاں مویشیوں کے لئے کسان لوگ اپنے کھیتوں میں سے چراگاہیں کیسے بنا سکتے تھے۔ سرکاری رکھیں بھی ریوڑوں کے لئے بند تھیں۔ اسلئے محض حالات سے مجبور ہو کر وہ سرکاری قانون کی خلاف ورزی کرتے رہتے تھے۔ ورنہ ان میں کسی شیطانی قوت یا گناہ کرنے کی قوت کا دخل نہ تھا۔ گلاب رائے بوڑھے نمبردار کا ریوڑ دن بھر رکھ میں چراتا تھا۔ خوبصورت دیوداروں کے نیچے پلی ہوئی ہری ہری تیتی گھاس دودھ دینے والے چوپایوں کے

لئے بہت عمدہ تھی اور کہیں کہیں ان دیواروں کے چھتناروں تلے چھوٹے چھوٹے قدرتی مرغزار بن گئے تھے۔ جہاں گاؤں کے چرواہے اور چرواہیاں اکٹھے ہو کر کھیلا کرتے تھے۔ چھ سال سے پندرہ سولہ سال تک کے لڑکے اور لڑکیاں اسی قدرتی مکتب میں تعلیم پاتے تھے۔ وہ درختوں پر بندروں کی طرح چڑھنا سیکھ جاتے۔ اخروٹوں سے نشانہ لگاتے، گیدڑ، سُور، خرگوش اور بجو جنگلی جانوروں کے لئے زمین میں ایسے خوفناک ڈربے تیار کرتے کہ جہاں کہیں کسی درندے نے ڈربے پر پاؤں رکھا۔ وہیں ڈربے میں اسکی ٹانگ الجھی رہ گئی۔ اب وہ ہزار چھڑائے۔ لیکن ڈربہ اسے کہاں چھوڑ سکتا تھا۔ دوسرے دن چرواہے ڈربے میں پھنسے ہوئے درندے کو دیکھتے اور پھر سارا گاؤں اکٹھا ہو جاتا۔ گیدڑ اور سُور تو فوراً ہلاک کر دیئے جاتے۔ کیونکہ یہی دو جانور فصل کو بہت نقصان پہنچاتے ہیں اور پیارے پیارے خرگوش چرواہوں کے لئے دلچسپ کھلونے بن جاتے۔ لیکن گلاب کو ڈربے بنانے میں مزا نہ آتا تھا۔ ہاں اب وہ آہستہ آہستہ ریوڑوں کی تنظیم و تربیت سے خوب واقف ہو گیا تھا۔ اور انہیں اکٹھا رکھنے جنگل میں منتشر کر دینے اور خطرے کے وقت پھر واپس اپنے پاس بلا لینے کی ترکیبوں سے اب بخوبی آگاہ ہو گیا تھا۔ وہ بنسری اور الغوزے بجانے میں بھی ماہر ہو گیا تھا۔ اور دوپہر کے وقت جب سورج کی کرنیں اور چیڑوں کے نکیلے پتوں کے ہلتے ہوئے سائے سبز گھاس پر ایک دلفریب شطرنج بن دیتے اور ریوڑوں کی آنکھیں نیند کے بار سے بند ہوئی جاتیں اور چرواہے اور چرواہیاں مختلف کھیلوں سے تنگ آ گئے ہوتے اسوقت گلاب کی بنسری کا سنہری نغمہ ان تنبد کے ماتوں کو ایک میٹھی مدہوشی کے

رو پہلی مرغزاریں لے جاتا نوجوان چرواہیوں کی نگاہیں فضا میں اونچے مرمریں برج تراشنے لگتیں اور چرواہے کنکھیوں سے اپنی اپنی محبوب چرواہیوں کی طرف تکتے۔ اسوقت چرواہیوں کے سخت اور کھردرے ہاتھ انہیں ریشم کی طرح ملائم اور صاف معلوم ہوتے گلے میں پڑی ہوئی چاندی کی ہنسلی شعلے کی طرح تڑپنے لگتی۔ آنکھوں میں محبت کی ملائمت اور تمتماتے ہوئے سُرخ رخساروں پر شرم کی نمی آجاتی۔ پریشان اور عطر و خوشبو سے ناآشنا بالوں کا ہر پیچ ایک سنہری حلقہ بن جاتا۔ لڑکپن اور جوانی کے درمیانی وقفے کی الفت میں شباب کی سی اہلیت جنسی اور پختہ کاری تو نہیں تھی۔ لیکن اسکی کمی کو ایک الھڑ معصوم شعریت پورا کر دیتی۔ اسکے نغمے کے بہاؤ میں ہر نوجوان چرواہے اور چرواہی کا دل ہچکولے لینے لگتا۔ زندگی کا ہر تار مرتعش ہو جاتا اور گلاب کی بنسری کی دھیمی لے کے ساتھ کسی چرواہے کی آواز جنگل کو اپنی میٹھی اُداسی سے بھر دیتی۔

اس طرح میٹھے نغموں اور نیند کی ہلکی ہلکی مدہوشیوں کے درمیان جہاں حقیقت اور خواب کی حدیں مل جاتی تھیں، دوپہر گذر جاتی، اور ریوڑ پھر چرنے لگتا۔ چرواہے انگڑائیاں لے کر اُٹھتے اور چوپایوں کی پیٹھ پر ہلکے ہلکے سونٹے مار کر انکی پیٹھ کو سہلاتے اور اپنی مدہوشی کو دور کرتے پھر کسی چشمے کے کنارے چلے جاتے۔ جسکے عکس میں چرواہیاں اپنے چہرے صاف کرتیں، ہاتھ اور پاؤں دھوتیں۔ اور اکثر جھک کر، وہ چند لمحوں کے لئے اپنا چہرہ چشمے کے صاف پانی میں چھپا کر اپنی آنکھیں کھول دیتیں۔ تو انہیں ایک عجیب دُنیا نظر آتی چشمے کی تہ میں ہر کنکر ایک ہیرے اور جواہرات سے تراشا ہوا محل معلوم دیتا۔ مینڈکوں کے جسم پھیل کر خوفناک دیو بن جاتے۔ پانی

میں اُگی ہوئی گھاس ایک سبز جنگل کی صورت اختیار کر لیتے اور سورج کی تڑتڑاتے ہوئے جلتے سنہری اور روپہلی میدان بن جاتے۔ جہاں پانی کی پریاں سب انسانوں کی نگاہوں سے بچکر ناچا کرتی تھیں چرواہے چشمے سے نکلتے ہوئے چھوٹے نالے میں بیٹھ جاتے اور گھاس کی سخت پتلیاں جنکہ اُنکی پن چکی بناتے اور نالے کے ایک ننھے سے آبشار کے مُنہ پر اسے لگا دیتے گھاس کی بنی ہوئی پن چکی زور زور سے چکر لیتی ہوئی چلتی تھی اور چرواہے اسے دیکھ کر ہنستے تھے اور اپنے انجنیری کے کمال پر خوش ہوتے تھے۔ اسیطرح کھیلوں میں سہ پہر گذر جاتی اور جب سورج جنوب مغربی سلسلہ ہائے کوہ کے پرے جانے لگتا۔ تو چوپایوں کے گلوں میں بجتی ہوئی گھنٹیوں کی آواز کے ساتھ چرواہے واپس گاؤں میں آجاتے۔ اور گلاب کی دلکش زندگی ختم ہوجاتی، اب اسے بوڑھے نمبردار کی گایوں اور بھینسوں کو دوہنا ہوتا، جانوروں کے لئے چارہ اور اناج ڈالنا ہوتا۔ مویشی خانہ میں لاؤ تیار کرنا ہوتا۔ وہ الاؤ جس میں آگ کم اور دھواں زیادہ ہوتا تھا۔ کیونکہ دھوئیں میں مچھر اور مکھیاں جانوروں کو کم ستاتے ہیں۔ رات کو اسے دو مکی کی موٹی روٹیاں اور آلو کا سالن مل جاتا۔ یا گنہار کی کڑہی اور چانول، یا چانول اور گندم کا اُبلا ہُوا ساگ۔ ست نرائن کہ گاؤں کا نمبردار تھا لیکن اسکے ہاں بھی وہی کچھ پکتا تھا۔ جو گاؤں کے غریب سے غریب براہمن کے ہاں۔ اس لئے خوراک کے معاملے میں گلاب بھی گاؤں کے دوسرے افراد سے زیادہ بدقسمت نہ تھا۔ فرق صرف اتنا تھا۔ کہ ست نرائن کی بیوی اکثر سالن پکاتے پکاتے وہ سالن میں نمک ڈالنے سے پہلے گلاب کے لئے سالن نکال لیا کرتی تھی، کیونکہ گاؤں میں نمک

کپڑے سے بھی مہنگا تھا۔ نمک اور گڑ۔ اسلئے گلاب کا سالن اکثر بے نمک ہوتا تھا اور مکھن کے بغیر، روٹیاں اکثر ان چپڑی اور باسی ہوتی تھیں۔ اور جب کبھی گھر میں گڑ کے میٹھے چاول پکتے تھے۔ اور ان کی سہانی خوشبو لڑکوں کو بے تاب کر دیتی۔ تو اکثر گلاب کا حصّہ بھی وہی کھا جاتے تھے۔ اور گلاب کی بے تابی غم و غصہ میں تبدیل ہو جاتی، اور وہ منہ پھلائے مویشی خانہ میں جا کر سو جاتا تھا۔ کیونکہ وہ نمبردار کے مویشی خانہ کا چوکیدار تھا۔ مویشی خانہ میں چوپاؤں کے جسموں کی کثیف بُو، پیشاب کا بھیگا، اور الاؤ کا گندہ اور تیز دھواں اسے پہلے پہل بُرا معلوم ہوتا تھا۔ اسکی آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں، جسم پر خارش نکل آئی تھی۔ اور وہ کئی مہینے کھانستا رہا تھا۔ لیکن اب وہ ان چیزوں کا عادی ہو گیا تھا۔ خارش تو اب بھی اسے سردیوں میں نکل آتی تھی لیکن اسے کھٹمل اور پسو اب نہ ستاتے تھے۔ اسکے جسم کی نسائیت دُور ہو رہی تھی، اسکے ہاتھوں کی لمبی اور مخروط انگلیاں جو شاید کسی مصوّر یا عورت کی ہوتیں تو بہتر ہوتا، اب جسمانی کسرت سے سخت اور کھردری ہو گئی تھیں۔ اُسکے پاؤں میں بیائیاں پھوٹ آئی تھیں، اور سردیوں میں اکثر یہ بیائیاں بہت بڑھ جاتیں۔ اور جب ساگرہ کے پہاڑوں پر اور ساگرہ کی وادی میں برف جم جاتی تو اسے مویشی خانے سے چوکھر نکالنے اور برف پر چلنے میں بہت دِقّت ہوتی کبھی کبھی ان بیائیوں میں سے خون رس کر بہنے لگتا اور اسکے پاؤں سُوج کر بھاری ہو جاتے، اور وہ شدّت درد سے چلّا اُٹھتا۔ اس نے کئی دفعہ ستنرائن کی بیوی ہمیشہ اسے یہ کہہ کر ٹال دیتی تھی۔ کہ بڈیا اگلے سال ضرور بنوا دونگی۔ گلاب ستنرائن کی بیوی کو ماں کہا کرتا تھا، گو اُسے پتہ تھا۔ کہ اسکی حقیقی ماں کون

تھی۔ اور کن حالات میں گاؤں سے نکل بھاگی تھی۔ اور کس طرح اس نے گاؤں
والوں کے کہنے کے مطابق ایک دور کے گاؤں میں خودکشی کر لی تھی، اسے ان
سب باتوں کا پتہ تھا۔ اور کئی دفعہ چھدوا نے اور چھدوا انہوں نے اسے تنگ کرنے
کی خاطر یہ باتیں جا کر اسکے سامنے دُھرائی تھیں۔ اور دیدگا جسے وہ اس قدر پیار
کرتا تھا۔ اور جسکے لئے وہ اپنی جان تک دینے کو تیار تھا۔ اسے خاصکر بہت چڑاتی
تھی اور یہ باتیں سنتا سنتا وہ اپنا چہرہ اپنی میلی قمیص میں چھپا کر رونے لگ جاتا تھا
اسے رونا بہت آتا تھا، وہ ذراسی تکلیف پر رو دیتا تھا۔ اور ذراسی بات پر ہنس دیتا
اور چھدوا انہوں کو اسے رلانے میں بہت مزہ آتا تھا۔ لیکن ست نرائن کی بیوی تو سچ
مچ اُسے رلانا نہیں چاہتی تھی، وہ آخر ایک عورت تھی اور جمنا کے ساتھ نفرت ہوتے
ہوئے بھی اُسے جمنا کے ساتھ ہمدردی تھی۔ وہ اسکے بیٹے کو چمڑے کے جوتے بنوا
دیتی، لیکن وہ کیا کرے خود اسکے اپنے بیٹا بیٹیوں کے پاس چمڑے کے جوتے نہیں
ہوتے تھے کبھی ایک کے پھٹ جاتے اور کبھی دوسرے کے۔ اور اکثر انہیں گھاس
کی پولیں پہننی پڑتی تھیں۔ بلکہ گاؤں کے اکثر افراد تو دھان کے خشک پودوں کو
بٹ کر پولیں تیار کر لیتے تھے۔ اور انہیں کو اپنے پاؤں میں پہنتے تھے۔ یہ پولیں
چمڑے کے جوتوں سے بدرجہا بہتر ہوتیں، مذہبی نقطہ نگاہ سے بھی اور جسمانی آرام
کے خیال سے بھی، کیونکہ چمڑے کے جوتے تو برف پر فوراً پھسل جاتے تھے لیکن
یہ دھان کے خشک پودوں سے تیار کی ہوئی پولیں کبھی دھوکا نہیں دیتی تھیں
یہ بات سچ ہے کہ ان پولوں سے سردی سے بچاؤ نہیں ہو سکتا۔ اور پاؤں اکثر
نیلے ہو جاتے تھے اور بیائیوں سے خون بہنے لگتا تھا۔ لیکن کیا کیا جائے چمڑہ بہت

مہنگا تھا۔ اور موچی عوضانہ بہت مانگتے تھے۔ اور یوں بھی تو گائے اور بھینسوں کے جسموں سے بنے ہوئے جوتے برہمنوں کے پاؤں کو زیب نہیں دیتے تھے۔ اسی لئے تو گلاب کے لئے چمڑے کے جوتے کبھی نہ بن سکتے تھے۔

وہ یخ البستہ سردی میں رات کو مویشی خانہ کا تنگ دروازہ بھی بند کر دیتا۔ اور الاؤ کے دھکتے ہوئے کوئلوں میں اپنے سر پیر ڈال دیتا۔ پیر اس قدر سُن ہو چکے ہوتے کہ بہت لمحے گزر جانے کے بعد ہی ان میں زندگی کی حرارت عود کرتی اور اسے انگاروں کی گرمی کا احساس ہوتا۔ وہ بہت دیر تک اپنے پاؤں الاؤ میں سینکتا اور جب پاؤں اور جسم خوب گرم ہو جاتے۔ تو اپنا دُہرا کمبل اوڑھ کر چارپائی پر دراز ہو جاتا۔ اکثر راتوں کو اُسے دُرگا کی صورت بہت تنگ کرتی تھی۔ اور مویشی خانہ کی پھیلی ہوئی کثیف دھند میں کہ جس میں گندہ بیروزہ کی سی بُو ہوتی تھی۔ وہ اپنے تیز تخیل کی مدد سے دُرگا کا شوخ چہرہ جسکے داہنے گال میں ہنستے وقت ایک دلفریب ڈمپل پڑتا تھا، ایک واضح صورت میں گھڑ لیتا تھا۔ دُرگا اسے بہت ستاتی تھی۔ اکثر اسے گالیاں بھی دیتی تھی اور اسکی ماں کا قصّہ دہرایا کرتی تھی اور اسے بار بار لایا کرتی تھی، لیکن اب رو رو کر گلاب کا رونا بہت کم ہو گیا تھا مشقت کرتے کرتے اسکے جسم کی نسائیت دُور ہو چکی تھی، صرف اسکے چہرے پر اور اسکی آنکھوں کی پتلیوں میں کسی سنہری اور اداس خواب کا ہلکا سا پرتو باقی رہ گیا تھا۔ اور جب گلاب کا دل بہت رنجور ہو جاتا تو وہ اسی اداس خواب کو اپنی بانسری کے نغمے میں ڈھال لیتا تھا۔ پھر رات کی تنہائیوں میں وہ کبھی مویشی خانے کے کواڑ کھول دیتا اور اس کی دہلیز پر بیٹھ کر اپنی سوئی ہوئی بانسری کو جگاتا۔ اسکے سانس کی لطافت سے بانسری

حرکت میں آجاتی اور اس کے نغمے زیادہ گہرے ہو جاتے، ان کی سسک اور تڑپ اور دل کا دکھ بڑھ جاتا۔ مدھم نغمے کے ناچتے ہوئے تال پر گاؤں کی کنواریوں کا دل تیزی سے حرکت کرنے لگتا اور بوڑھی عورتوں کو کرشن مراری یاد آجاتے۔ ایک دن بوڑھے نمبردار کی بیوی نے جسے وہ ماں کہا کرتا تھا اس سے کہا "بیٹا تم رات کو ایسی بنسی نہ بجایا کرو!"

"کیوں ماں؟"

"بیٹا میرا دل دُکھتا ہے۔ میں کل رات کو مالا پھیر رہی تھی کہ میں نے تمہاری بنسی سُنی۔ اور میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے۔ میں نے سوچا کہ گوکل میں گوپیوں کے درمیان کرشن مراری اسیطرح بنسی بجاتے ہونگے۔ بٹیا تم یہ بنسی نہ بجایا کرو"

لیکن کئی راتوں کو بنسی کا یہ نغمہ درگا کے دل کو بھی بیتاب کر دیتا تھا۔ اور یہ جان کر کہ ان نغموں کا محبوب کون ہے، اسکے دل میں ایک نامعلوم سی خوشی گدگدی لیتی۔ بستر پہ لیٹے لیٹے اسکا سارا جسم ٹوٹنے لگتا۔ اسے اپنے گالوں پہ ایک شعلہ سا جلتا ہوا محسوس ہوتا اور شعلے کی لپک اُسکے کانوں تک پہنچ جاتی۔ اور وہ چاہتی کہ کوئی اسے اپنے طاقتور بازوؤں میں لے اور بھینچ بھینچ کر اُسے اپنے گلے سے لگائے۔ حتیٰ کہ اسکی سانس بند ہونے لگے۔ لیکن صبح ہوتے ہی اپنے اس احساس پہ شرمندگی اور ندامت سی محسوس ہوتی، اور جب وہ جنگل میں گلاب سے ملتی تو اس سے ایسی درشتی اور سخت کلامی سے پیش آتی۔ کہ بچارے لڑکے کا رنگ متغیر ہو جاتا اور وہ مرعوب ہو کر پیچھے ہٹ جاتا۔ اور جب وہ اپنے اسکی حالت کو دیکھ کر ہنستے اور قہقہہ لگاتے لیکن جب گلاب اپنے تخیل میں درگا کو بلا لیتا تھا۔ تو درگا ایک مہربان دلوی کیطرح اُسکے

پاس آجاتی تھی، لمبی، پتلی اور خوبصورت بنج کی شاخ کی طرح۔ پھر گلاب کو وہی لمحے یاد آتے، جب سچ مچ درگا نے اسے پیار کرنے کا موقع دیا تھا۔ ایک بار جب درگا نے سردرد کی شکایت کی تھی۔ اور وہ اس کا سر اپنی رانوں پر رکھکر دو گھڑی دباتا رہا تھا۔ ایک بار جب اس نے بنفشہ کے پھولوں کا گچھا اسکے بالوں میں ٹانک دیا تھا۔ اور اسکی ٹھوڑی اٹھاکر اور اسکے دونوں رخسار اپنے ہاتھوں میں لیکر اسکا منہ چوم لیا تھا۔ اور درگا کی محبت آمیز خاموشی نے اسکے دل کو خوشی سے بھر دیا تھا۔ ایک بار اونچے اونچے دیوداروں کے تنوں کے نیچے اُگی ہوئی گرچ کی جھاڑیوں کے درمیان جب وہ گرُچ کے سرخ سرخ پھل کھا رہے تھے۔ درگا نے یکایک ہاتھ بڑھاکر گرُچ کے سرخ دانے اسکے منہ میں ڈالدیئے تھے۔ اور گلاب نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ اور پھر وہ دیر تک اسطرح ایک دوسرے کو توڑ توڑ پھل کھلاتے رہے تھے...... لیکن ایسے لمحے گلاب کے لڑکپن میں بہت کم آتے تھے۔ اور اب اُن لمحوں کی شیرینی اور خوبصورتی کی یاد اسکے دل میں ٹیس سی پیدا کر دیتی تھی۔

..... اور پھر گلاب کو موسمِ خزاں کی وہ شام یاد آئی۔ کہ جب نالے میں پانی چڑھا ہوا تھا اور وہ اور دیگر چرواہے جنوب مغربی پہاڑوں کے جنگلوں سے اپنے ریوڑوں کو چرا کر واپس گاؤں کو لا رہے تھے۔ اس نے درگا کو اپنے کندھوں پر اُٹھا لیا تھا اور نالے میں سے گذر رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ایک سونٹی کے سہارے چل رہا تھا۔ پانی برف کی طرح ٹھنڈا تھا اور درگا اسے چھیڑنے کیلئے آہستہ آہستہ گنگنا رہی تھی۔ اور ہنس رہی تھی۔ نالے کے درمیان جہاں پانی زوروں پر تھا۔ گلاب یکایک کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔ شریر لڑکی، اب میرا جی چاہتا ہے کہ تمہیں یہیں پانی میں گرا دوں۔ بولو، کیسا

مرا بھی ہے گا دُرگا نے فوراً ایک چیخ مار کر گانا بند کر دیا۔ اور زور سے اسکے گلے سے لپٹ گئی۔ اور اپنی ٹانگیں زور سے اسکی چھاتی سے لگا لیں ٭

گلاب اپنی چالاکی پر بہت خوش ہوا وہ اسی لمحہ کو زیادہ لمبا کرنا چاہتا تھا لیکن کمبخت پانی بہت ٹھنڈا تھا اسے پانی کے ٹھنڈا ہونے کا احساس تھا۔ اور اسکے ساتھ ہی اپنے گلے میں حمائل بازوؤں کی نرمی اور گرمی اسکی چھاتی پر لٹکتی ہوئی لاتوں کے حسین تناسب اور ان نازک ٹخنوں کی گولائیوں کا بھی احساس تھا۔

لیکن پانی اس قدر ٹھنڈا تھا کہ وہ آگے چلنے پر مجبور ہو گیا۔ اور درگا نے پھر گانا شروع کر دیا۔

راستے میں گلاب پھر ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔ اور بولا :۔

"ایک بات کہوں۔ اگر تم بھی سچ سچ کہو؟"

"کہو، میں بھی سچ سچ کہوں گی"

"تمہیں شو جی کی قسم!"

"ہاں مجھے شو جی مہاراج کی قسم!"

"کیا میں تمہیں اچھا لگتا ہوں؟"

کچھ عرصہ گلاب خاموشی سے پانی میں کھڑا رہا۔ پھر دُرگا بولی۔ نہایت سنجیدہ لہجے میں اب تم نے جو من کی بات پوچھی ہے، تو میں بھی سچ سچ کہونگی۔ تم مجھے اچھے تو لگتے ہو لیکن اتنے اچھے نہیں کہ میں تمہارے ساتھ بھاگ جاؤں۔ اور پھر شادی تو ماں باپ کے بس میں ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ تمہاری میری شادی کبھی نہیں ہو سکتی۔ ایک تو تمہاری ماں کا قضیہ ہے۔ اور پھر... بُرا نہ ماننا... تمہارے پاس نہ زمین ہے نہ

زیور، نہ مکان ..... کچھ بھی تو نہیں ..... بُرا نہ ماننا گلاب ..... تم نے من کی بات پوچھی تھی۔

گلاب یکایک آسمان سے زمین پر اُتر آیا۔ اُسے ایک دھچکا سا محسوس ہُوا۔ وہ کوئی بات نہ کہہ سکا۔ اور سچ مچ دُرگا کی باتوں کا اسکے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ پانی میں چلتے چلتے اسے محسوس ہُوا کہ اسکی ٹانگیں بے جان ہو گئی ہیں۔ اور وہ خود بھی ایک بے جان بوجھ کو کندھوں پر اُٹھائے ہوئے گزر رہا ہے۔

پھر کنارہ آگیا۔ اور دُرگا فوراً ہی اسکے کندھوں سے اُتر بیٹھی۔ اور وہ ایکدوسرے سے آنکھیں نہ ملا سکے۔

رات کو مویشی خانہ کی دہلیز پر بیٹھے بیٹھے اس نے اپنی بنسری کو کئی بار چھیڑا۔ لیکن وہ اسے لبوں تک نہ لے جا سکا۔ اور اسے احساس ہُوا کہ اب اس بنسری میں کوئی نغمہ ہی باقی نہیں ہے۔

باون پتّے

حسن عباس بی۔ اے

بند کمرے میں ایک دُھلی ہوئی چادر پر سُرخ رنگ کے تاش پتّے بکھرے ہوئے تھے ـــــ یہ ایک پُرانی وضع کا کمرہ تھا۔ کونے میں رکھی ہوئی میز کی چھاتی پر دو ایک ضخیم کتابیں پڑی تھیں۔ جنکے کھُلے اوراق پر آتشِ نفس انسانوں کے افکار سلگ رہے تھے۔ کمرے کی وزنی چھت کو ایک بوڑھا شہتیر اپنے سینہ کے زور سے سنبھالے ہوئے تھا۔ اپنی اس مظلوم حالت میں احتجاج کے طور پر وہ کبھی کبھی کڑکڑ کی صدا بلند کر دیتا تھا۔ درمیان سے اسکی کمر بھی جھک گئی تھی، اور اس خلا میں ایک بوڑھے چڑے چڑیا نے گھونسلا بنا رکھا تھا۔ کہنہ دیوار کے ایک روشندان سے وہ روزانہ دانہ دُنکا چگنے کے لئے اڑ جاتے۔ ان ننھے منّے پرندوں کی روحوں کو جنگل کے بڑی چونچ والے پرندوں نے خوفزدہ کر رکھا تھا۔ انکی ہم نوا چڑیوں کو بھی انہوں نے پر نوچ کر گنجا کر دیا۔ انہیں سر چھپانے کو جگہ نہ تھی ـــــ اپنی چڑ چوں میں محو یہ بوڑھا جوڑا اس بڈھے گھونسلے میں موت کیلئے پھیلاوا بنکر زندگی کی شام اس کمرے کی بند فضا میں بسر کر رہا تھا۔

عموماً دوپہر کو جب ایک نئے بلا نیلا لڑکا بالائی منزل سے دو دوستوں کے ساتھ تاش کھیلنے کے لئے کمرے میں آتا تو یہ دونوں اُنکے کھیل کو گہری نظروں سے دیکھتے۔

شاید انہیں ان سُرخ و سیاہ اشکال سے کچھ دلچسپی ہو گئی تھی۔

——— چادر پر بکھرے ہُوئے پتّوں نے آج خود بخود حرکت کرنا شروع کر دی چڑے چڑیا نے کبھی یہ کھیل نہ دیکھا تھا۔ اپنے گھونسلے سے گردنیں لٹکائے اُنہوں نے غور سے اس طلسم کو دیکھنا شروع کیا———

ایک مختصر سی حرکت کے بعد یہ پتے کچھ اور بکھر گئے۔ یکایک اینٹ کا بادشاہ باہر نکلکر کھڑا ہو گیا۔ اور اس نے نخوت پسندی سے اینٹ کے غلام کو آواز دی۔ کوئی جواب نہ پاکر وُہ بڑبڑایا اور اپنے ہم جلیسوں کے قریب تر ہو کر ایک بار پھر آواز دی۔ لیکن اسکی پکار کا کوئی جواب نہ تھا۔ غصّہ سے اُسکی آنکھیں سُرخ ہو گئیں اور اُس نے پتّوں میں سے اس غلام کو جبراً کھینچ کر باہر نکال لیا———

اوندھے مُنہ پڑے ہُوئے پتے یکایک ہوشیار ہو گئے۔ حکم، پان اور چڑیا کا بادشاہ بھی اُٹھ کر اپنے ہم مرتبہ کی صف میں کھڑے ہو گئے———

"تم آواز کا جواب کیوں نہیں دیتے——— بہرے ہو گئے ہو کیا؟"

دفعتہً غلام کی آنکھیں اپنے غضب ناک آقا کی طرف اُٹھیں۔ وہ ارادتاً ذرا پیچھے ہٹ گیا۔ اینٹ کے بادشاہ نے بڑھکر اُسکے ایک زبردست چپت رسید کیا ——— آقا عموماً آپے سے باہر ہو جایا کرتے ہیں۔

غلام نے اپنا ہاتھ سُرخ گال پر رکھ لیا خونناب آنکھوں سے اس نے دوبارہ آقا کے ڈراؤنے چہرے کی طرف دیکھا۔ سر پھرا آقا یہ بھی برداشت نہ کرسکا اور اُس نے غلام کو بُری طرح سے نوچنا شروع کیا۔ جُملہ بیگمات اس منظر کو دیکھ کر گھبرا گئیں ملکے پتّے بھی ایک دوسرے سے اشاروں میں باتیں کرنے لگے۔ پان، حکم اور چڑیا

کے غلام بھی آنکھیں کھولے گہرے سانس لے رہے تھے ——— سرد آہیں ملوکیت سے خائف غلاموں کے جذبۂ احتجاج کی گرمی کو اندر رہی اندر ٹھنڈا کر دیتی ہیں ———

یکایک پان کے غلام نے بڑھکر بادشاہ کے ظالم ہاتھ کو روک لیا۔

"ٹھہریئے اب آپ کو ظلم و تشدد سے ہاتھ کھینچنا ہو گا؟"

پان کا غلام غصّہ سے کانپ رہا تھا۔ بادشاہ نے اُسے زور سے ایک جھٹکا دیا! وہ بے تحاشا گر پڑا۔ زمین سے ٹکراتے ہی اسکے سر سے خون کی دھار بہنے لگی۔

"بادشاہ آپ کیا کر رہے ہیں!" ——— اینٹ کی بیگم بے خود ہو کر آگے بڑھنے لگی۔ لیکن بادشاہ کی خونیں نگاہوں نے اسکی جراُت کو پسپا کر دیا۔

حکم کے بادشاہ نے جو اپنے ساتھیوں سمیت تماشا دیکھنے میں مصروف تھا، حکم کے یکّہ کو اشارہ سے بلا کر پان کے غلام کی گرفتاری کے لئے حکم دیا۔

"لیجاؤ اس غلام کو جیل خانہ میں۔ کمبخت کہیں کا آقا کے سامنے ہاتھ اُٹھاتا ہے" ——— حکم کا بادشاہ ملوکیت کا خدا نظر آتا تھا۔

تاش کے ہلکے پتّے جذبات کے انتہائی اشتعال سے کانپنے لگے! ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ان میں بغاوت کی رُوح سما رہی ہے۔

"ہم آپکے غلام سہی لیکن ہم اپنا جسم و جاں آپکے حوالے نہیں کر سکتے مجھے قید کیوں کرتے ہو۔ میں کُھلی فضا میں جینا چاہتا ہوں۔

جھوٹی طاقت کے خوف سے ڈرو۔ تمہارا تشدّد ہماری ضمیر کو مُردہ نہیں کر سکتا!" پان کا غلام گرفتاری کے وقت چِلّا چِلّا کر آقاؤں کو قائل کرنا چاہتا تھا۔

اسکی اُس دلیری پر حکم کے یکّہ نے اسکے چانٹا رسید کیا ———

مُشتعل پتّے بیدھڑک ہو چکے تھے۔ حکم کا غلام اپنے ساتھی کی یہ بے قدری نہ دیکھ سکا۔ اُس نے بڑھ کر یکّہ کو اپنے سیاہ بازوؤں کی گرفت میں لیکر پان کے غلام کو آزاد کرانے کے لئے جھٹکا دیا۔ چڑیا کا غلام بھی سامنے تن گیا ——

—— اب شاہوں کے پاسباں یکّوں نے غصہ میں آکر ہنٹر برسانا شروع کر دیئے۔ وہ تشدّد سے غلاموں کو زیر کرنا چاہتے تھے۔ ہلکے پتّوں کا مُشتعل مجمع تند بھبر بول کی طرح ان پر ٹوٹ پڑا۔ مجموعی طاقت کے سیلاب کے آگے یکّے اور بادشاہ جو اس کھلبلی میں اب بیگمات کو سنبھال رہے تھے خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے —— بلو کبت جسکے رعب نے انکی زندگی کو پاؤں تلے دبا رکھا تھا۔ آج انکے کندھوں پر جنازہ بن کر موت کی کڑوی نیند سو رہی تھی —— غلاموں کی آزادی اس کے تابوت کا آخری کیل تھی۔

غلاموں اور آقاؤں کی اس مڈبھیڑ میں پان کی تنگی اور حکم کے چھوٹے پنجے کے بھی معمولی چوٹیں آئیں۔

—— آزاد پتّوں نے اب اپنی ترتیب کو بالکل بدل دیا تاکہ آئندہ کوئی پتہ کسی دوسرے کھلاڑی کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنکر ایک دوسرے پر وار نہ کر سکے ——

یہ کھیل دیکھکر مبہوت چڑے نے چڑیا کے کان میں کچھ چہچہاہٹ کی۔ دونوں جنگل کی کھلی فضا کی طرف پرواز کر گئے۔

یہ مرد

اوپندر ناتھ اشک

کسی قسم کے احساس کے بغیر گوبند نے چپ چاپ لکشمی کی چارپائی کے ارد گرد پردے لگا دیئے، پردے جو لکڑی کے فریم میں سفید کپڑا لگا کر بنائے گئے تھے۔ در حسب خواہش کھولے یا بند کئے جا سکتے تھے۔ تب مس سلطانہ اور بیٹی تیز تیز چلتی ہوئی آئیں اور اُنکے بعد متین اور سنجیدہ ڈاکٹر صاحب اپنے بھاری قدم آہستہ آہستہ اُٹھاتے ہوئے پردوں کے اندر چلے گئے۔

کچھ لمحہ تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ صرف چھت پر لگے ہوئے سفید پروں والے پنکھے اپنی پوری رفتار سے گھر گھر کرتے رہے۔ اور جون کی تپتی دوپہر اپنی نیم وا آنکھوں سے غنودگی کی سی حالت میں چپ چاپ پڑی رہی۔

یکایک پردے کے پیچھے سے کچھ اُکھڑی اُکھڑی سانسوں کی آواز آئی۔ پھر لکشمی کے بہکے بہکے الفاظ اور پھر سلطانہ کی لمبی سانس! ڈاکٹر نے کہا۔ سسٹر پچر لے آؤ! اور یہ کہکر پردے کے پیچھے سے نکل، وہ جیسے آئے تھے، ویسے ہی چلے گئے۔ ان کے پیچھے رومال سے آنکھیں پونچھتی ہوئی سلطانہ نکلی۔ دوسری طرف بیمار عورتیں تجسس بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اسکے نکلتے ہی رشیدہ نے پوچھا

— "کیوں؟"

"ختم ہو گئی!" — بھرے گلے سے سلطانہ نے جواب دیا۔

"آخری وقت کیا کہتی تھیں؟" — سرتی بولی۔

"صرف ایک بار کھنہ صاحب کو یاد کیا اور بس!" اور یہ کہکر آنسو پونچھتی ہوئی سلطانہ جلد جلد سسٹر بیجر لینے کے لئے چلی گئی۔

لکشمی اپنے خاوند کو کھنہ صاحب کہہ کر پکارا کرتی تھی۔ وہ لاہور ہی میں ملازم تھے۔ وہ ہر ساتویں دن باقاعدہ اسے دیکھنے آتے تھے۔ کوئی ایسے خوش شکل تو نہ تھے۔ مگر ایسے بھی نہیں کہ بدصورت کہے جا سکیں۔ انکی آنکھوں میں کچھ ایسی بات تھی۔ کہ آدمی بیساختہ انکی طرف کھنچ جاتا تھا اور پھر اتنی باتیں کرتے تھے، اتنے قہقہے لگاتے تھے کہ جب وہ آجاتے تو ہسپتال کی اس خاموش اور ساکن فضا میں زندگی سی دوڑ جاتی فقط لکشمی ہی انکے آنے کا انتظار کرتی ہو یہ بات نہیں اس کھلے اور کشادہ کمرے میں لوہے کی سخت بے دردچارپائیوں پر لیٹی ہوئی بخار، حرارت، دوا، پرہیز کی باتیں سن سُنکر عاجز آئی ہوئی دوسری بیمار عورتیں بھی انکے آنے کی راہ دیکھا کرتی تھیں۔ وہ باتیں چاہے اپنے رشتہ داروں سے کرتی ہوں، لیکن کان انکے ادھر ہی لگے رہتے تھے اور لکشمی، وہ تو نہ جانے یہ سات دن کیسے کاٹتی تھی؟ ہنستی تھی، دوسروں کو ہنساتی تھی، لیکن اس تمام ہنسی اور ٹھٹھے میں اپنے خاوند کا انتظار جیسے اسکے دل کے کسی نامعلوم گوشے میں چھپا رہتا تھا اور نہ کون جانتا ہے کہ یہ ہنسی قہقہے، ہسپتال میں ایک بار طلوع ہو کر پھر غروب ہی نہ

ہونے والے، دنوں کو کاٹنے کا محض بہانہ نہ تھے۔ یہ بات بھی نہیں اُسے اپنے خاوند سے اتنی محبت اس مہلک بیماری کے دنوں میں ہوئی، اُسی دن جب شادی کے بعد ایک مہینہ گزار کر وہ اپنے میکے واپس آئی تھی۔ تو اس کی سہیلیوں نے جان لیا تھا۔ کہ بستی کی آزاد فضا میں رات دن کھیلنے والی، گلی محلوں کو اپنے قہقہوں سے گونجا دینے والی لکشمی اب محبّت کی زنجیروں میں جکڑی گئی ہے۔

جب سہیلیاں اُسے چاروں طرف سے گھیر کر بیٹھ گئی تھیں تو اُس نے فخر سے کہا تھا "انکی بات پوچھتی ہو؟ وہ تو مجھے پل بھر کے لئے بھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ کتنی کتنی دیر میری طرف دیکھتے رہتے ہیں اور کہتے ہیں ......"

ذرا حیا سے اُس نے اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپا لیا تھا اور پھر سہیلیوں کے اصرار پر اس نے گلاب بن بن کر کہا تھا۔ کہتے ہیں "تم تو سورگ کی دیوی ہو میں تمہاری پوجا کرتا ہوں"

ستیا کی رشک بھری نظروں نے تب دیکھا تھا کہ اس کی یہ بات اپنے خاوند سے ہر ہندو عورت کو جو محبت ہوتی ہے، اسکی ہی مظہر نہیں بلکہ اس حقیقت پر مبنی تھی جسکی تائید اس کا رواں رواں کر رہا تھا۔ تب اپنے خاوند کی بے التفاتی کا دھیان آجانے پر ایک سرد آہ اُسکے دل کی گہرائیوں سے نکل گئی۔

ساوتری نے اپنے حسد کا اظہار ایک دوسرے ہی طریق پر کیا کھسیانی سی ہنسی ہنستے ہوئے بولی——"ہاں بہن، انہیں محبت کیوں نہ ہوگی۔ ایک بار ہاتھ سے گنوا کر ہی آدمی کسی چیز کی قدر کرنا سیکھتا ہے"

اس فقرے میں جو طنز پنہاں تھا اُسکی طرف دھیان دیئے بغیر سادہ لوح لکشمی

نے مسرت کی رَو میں سہیلیوں کو اپنی اس ایک مہینے کی ازدواجی زندگی کی بیسیوں کہانیاں سُنا ڈالیں تھیں۔ کس طرح اس کے شوہر اس پہ جان چھڑکتے ہیں۔ اسے آنکھوں سے اوجھل کرنا پسند نہیں کرتے۔ دفتر میں نہ جانے کیسے وقت گزارتے ہیں؟ "پہلی بیوی"

—— وہ کہتے ہیں "وہ تو گنوار اور بیوقوف تھی۔ نہیں پا کر تو میں نے زندگی کی مسرتیں پالی ہیں۔

"تارا نے تب ہنستے ہُوئے کہا ——" ساس کو یہ سب کچھ کیسے بھاتا ہوگا؟"

"اُنکے دل کی میں کیا جانوں"۔ لکشمی نے مسرت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ "لیکن میٹھی تو وہ ایسی ہیں جیسے مصری۔ بولتی ہیں تو رس گھول دیتی ہیں۔ میری تو عادت تم جانتی ہو سوتے سوتے دن نکل آتا ہے۔ مگر اُنھوں نے اس کا کبھی بُرا نہیں مانا۔ وہ خود چار بجے علی الصباح اُٹھ کر، نہا دھو، پوجا پاٹھ کر، گھر کا سب کام ختم کر دیتی ہیں۔ میں کچھ کرنے کی کوشش بھی کروں تو کہتی ہیں "تمہیں ہی تو کرنا ہے بہو۔ میں کب تک بیٹھی رہونگی"۔

اور اس دن بستی میں لکشمی کی رحمدل اور فرض شناس ساس اور محبت کرنے والے ہنس مکھ خاوند کی کہانی گھر گھر پھیل گئی تھی اور شادی شدہ لڑکیوں نے دعا کی۔ کہ اُنکے خاوند اور ساسیں بھی ایسی ہی بن جائیں اور کنواری لڑکیوں نے دل ہی دل میں کہا "بھگوان ہمیں بھی ایسا ہی گھر دے دینا"!

ربڑ کے پہیّوں والا اسٹریچر چپ چپ مشرقی دروازے سے داخل ہُوا۔ گوبند اسے دھکیل رہا تھا اور مس سلطانہ خاموشی سے اس کے ساتھ چلی آ رہی تھیں

اس کا ہمیشہ ہنسنے والا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ جیسے اسی کے کسی قریبی رشتہ دار کی موت ہو گئی ہو۔ موتیں ہسپتال میں ہمیشہ ہوا کرتی ہیں۔ اور ہسپتال کے ملازم اس درجہ ان کے خوگر ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنے سب کام کسی قسم کے احساس کے بغیر کئے جاتے ہیں۔ لیکن لکشمی سے سلطانہ کو محبت سی ہو گئی تھی۔ سلطانہ پر ہی کیا موقوف، سب کو اس سے اُنس ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی ازدواجی زندگی کے کتنے ہی واقعات ایک عجیب سادگی سے بیان کئے تھے۔ اپنی ساس کے متعلق اس کے دل میں جو بلند خیالات تھے۔ انہیں ہوا ہوتے دیر نہیں لگی وہی زبان جو پہلے رس کی دھاریں بہاتی تھی بعد کو زہر بھی اُگلنے لگی۔ لکھنہ صاحب تب ملازم نہیں ہوئے تھے۔ مگر گھر کی سیاسیات میں وہ ماہر تھے۔ اپنا کام چالاکی سے نکالنا جانتے تھے۔ ماں کے سامنے چُپ رہتے۔ لیکن تنہائی میں کہتے۔ "لکشمی ان سب قصوروں کے لئے میں تم سے معافی چاہتا ہوں"۔ اور تب اُسے ساس کی جھڑکیاں، طعنے کوسنے، گالیاں بالکل بھول جاتیں اور خاوند سے اُس کی عقیدت کئی گنا بڑھ جاتی۔ وہ ساتھ ہیں تو پھر چاہے سارا جہان خلاف ہو جائے، وہ سب کی مخالفت خوشی خوشی جھیل لے گی۔ جی نہ چاہتے ہوئے بھی ساس کو خوش کرنے کے لئے اس نے بھگوتی درگا کی پوجا سیکھی اور اپنی سہل انگاری کو چھوڑ کر محنت سے کام کرنے کی عادت بھی ڈالی۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود ساس کے تیور نہ بدلے۔ اس کی جھڑکیاں، طعنے، کوسنے بدستور جاری رہے۔ مگر لکشمی نے سب کچھ ہنس ہنس کر سہنا سیکھ لیا تھا۔ ہاں ایک بار جب جلتا ہوا گھی گر جانے سے اس کے ہاتھ جل گئے تھے اور ابھی آرام بھی

نہ آنے پایا تھا کہ اس کی ساس نے کپڑوں کی بھری گٹھڑی اس کے سامنے رکھ دی تھی، تو اس کی ہمیشہ مسکرانے والی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ کپڑے دھوتے دھوتے اس کے چھالے پھوٹ گئے۔ تب اندر کمرے میں جا کر وہ خوب جی بھر کر روئی تھی اور جب کھنہ صاحب آئے تھے تو اس نے کہا تھا" مجھے اس نرک سے چھٹکارا دلاؤ۔ ماں اگر دھن والی ہے تو کیا اسی لئے یہ نرک کی اذیتیں برداشت کئے جائیں۔ تمہارے ساتھ تو مجھے سوکھی روٹی پسند ہے۔ مگر یہ ظلم تو اب نہیں سہا جاتا!"

کھنہ صاحب نے اُسے تسلّی دی تھی اور مستقبل کے تصوّرات کا ٹھنڈا پھاہا اس کے جلتے ہوئے زخموں پر رکھ دیا تھا۔ اُنہوں نے کیا کیا کچھ نہ کہا تھا ـــــ جب وہ ملازم ہو جائیں گے تو اُسے اپنے ساتھ لاہور لے جائیں گے۔ ہاں تو تو اس شہر ہی میں رہے گی اور وہاں لاہور میں ـــــ انار کلی، مال، لارنس باغ، سینما، تماشے، نمائشیں اور ان ہی مسرّت بخش تصوّرات میں گم ہو کر وہ اپنے چھالوں کی ٹیسیں، اپنے دل کا درد سب کچھ بھول گئی تھی۔ لیکن سنگدل قسمت! جب وہ دن آیا اور کھنہ صاحب لاہور ہی میں سیکرٹریٹ میں ملازم ہو گئے تو وہ دق جیسی مہلک بیماری میں مبتلا ہو گئی۔

آہستہ آہستہ چلتا ہوا اسٹریچر برآمدے کے پیچھے پہنچا اور کچھ لمحے بعد سفید چادر میں لپٹا ہوا ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ لیکر دونوں طرف بچھی ہوئی چارپائیوں میں سے ہوتا ہوا مغربی دروازے سے باہر نکل گیا۔ ڈاکٹر صاحب برآمدے ہی میں کھڑے تھے

پہنچی۔ لیکن آج سعیٔ بسیار کے باوجود وہ لکشمی کی موت کو ہنسی کے پردے میں نہ چھپا سکی۔

رشیدہ نے کہا۔ "مس صاحب لکشمی بھی چلی گئی!"

تھرمامیٹر کو رشیدہ کی زبان کے نیچے رکھ کر سلطانہ نے ایک لمبی سانس لی۔ اور نبض کی رفتار دیکھنے کے لئے اسکی کلائی ہاتھ میں تھام لی۔

سُرتی نے کہا۔ "آخری وقت تک اپنے خاوند کا نام اُسکی زبان پر رہا کیوں مس صاحب! لکشمی صاحب بھی اس سے اتنا ہی پیار کرتے ہوں گے؟"

ہوں گے کیا۔ کرتے ہیں۔" سلطانہ نے رشیدہ کی کلائی کو چھوڑ کر کہا۔ "لکشمی کو مرنا بھی اسی لئے سہل ہو گیا۔ میں تو سوچتی ہوں۔ محبت کرنے والا خاوند جس خوش قسمت کے پاس ہے۔ موت اسے کچھ بھی تکلیف نہیں پہنچا سکتی بے ہوش ہونے سے کچھ دیر پہلے جب اسے معلوم ہو گیا۔ کہ اس کا آخری وقت بس اب نزدیک ہے تو مجھ سے اس نے کہا تھا ــــــ "مس صاحب جانے وہ کیوں نہیں آئے۔ کاش وہ میرے پاس ہوتے۔" پھر خود ہی ہنسکر بولی۔ "مس صاحب میں بھی کتنی بیوقوف ہوں، وہ نہ بھی آئیں تو وہ مجھ سے دُور رہیں گیا؟ میرے دل میں تو ہر وقت انہیں کی تصویر رہتی ہے۔ اور میں ہی اُن سے کیا دُور ہوں؟ کئی بار اُنہوں نے کہا ہے۔ "لکشمی! تم ہر وقت میرے پاس رہتی ہو۔ بارہا کام کرتے کرتے تمہارا خیال آجانے سے غلطی ہو جاتی ہے۔" اس کے بعد وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ مرتے دم بھی جب اسے ہوش آیا تو خاوند کا نام ہی اس کی زبان پر تھا۔"

وہیں سے اُنہوں نے کہا "مردہ خانے میں لے جاؤ۔ تب تک کھنہ صاحب آجائیں گے
لہٰذا سنگھ تو کب کا گیا ہوا ہے"۔

پل بھر کے لئے بیمار عورتوں کے دل دھک دھک کرنے لگے۔ لکشمی کا نحیف و
ناتواں دق سے مرجھایا ہوا، موت کی اس سفید چادر میں لپٹا ہوا مدقوق جسم سب
کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ دق کی اِن سب مریضاؤں کا بھی تو آخر یہی حشر ہوگا۔
موت سے بھی زیادہ اندوہناک ہے۔ اپنے ہی جیسی بیماری سے کسی کو مرتے دیکھنا اور خود
تل تل کر کے مرنا بہنوں کی آنکھوں کی سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ اور بعض کے آنسو
بہنے لگے۔

پردے کے پیچھے سے نکلکر مس بیلی غسلخانے میں ہاتھ صاف کرنے چلی گئی
تو ہمیشہ دوسروں کا دکھ درد بٹانے والی رحمدل سلطانہ نے اس غمناک ماحول کو
کچھ بدلنے کی کوشش کی۔ ہمیشہ یہی ہوتا تھا ہمیشہ، جب کوئی مریضہ اس بھیانک
بیماری کے ہاتھوں نجات پاتی تھی اور کمرے میں موت کی اُداس خاموشی چھا
جاتی تھی تو مس سُلطانہ اپنے میٹھے، تسلّی آمیز لہجہ میں اپنی دلچسپ باتوں، اپنے
حیرت انگیز قصوں سے اس موت کی خاموشی کو دُور کرنے کی کوشش کیا کرتی
تھی۔ برس ڈیڑھ برس سے لکشمی بھی اس کام میں اسکا ہاتھ بٹاتی آئی تھی۔ لیکن
آج وہ خود ہی موت کی گہری خاموشی میں سما گئی تھی۔

گھڑی نے ٹن ٹن دو بجائے۔ ٹمپریچر لینے کا وقت ہو گیا تھا۔ دل میں اُٹھتے
ہوئے آنسوؤں کے طوفان کو زبردستی روک کر، دوا میں پڑے ہوئے تھرمامیٹر کو
ہاتھ میں لئے اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے وہ رشیدہ کی چارپائی کے پاس

یہ کہتے ہوئے بھیگی آنکھوں کو پونچھ، گھڑی دیکھ کر سلطانہ نے تھرمامیٹر رشیدہ کے منہ سے نکال لیا اور حرارت نوٹ کرنے کے لئے چارٹ اُٹھایا۔

سُرتی نے پوچھا "لیکن مس صاحب یہ گہنوں کی بات کیا تھی۔ جب بھی کھنہ صاحب آتے تھے۔ انکا ذکر ضرور چھڑ جاتا تھا۔ جب سے گہنے لے گئے۔ بس ایک بار ہی تو پھر آئے"!

تھرمامیٹر کو دوا میں ڈالکر اور دوسرا اُٹھاکر سرتی کو دیتے ہوئے اُس نے کہا۔

"میں نے پوچھا نہیں، لیکن جب لکشمی آئی تھی تو سب گہنے ساتھ لائی تھی۔ اُسکی ساس نہیں چاہتی تھی کہ وہ ایک بھی گہنا ساتھ لے جائے۔ آخر ہسپتال میں اتنے گہنوں کا کام بھی کیا ہے؟ بازو بند، چوڑیاں، مالا، لاکٹ کوئی ایک گہنا ہو تو گناؤں۔ نہ جانے کیوں اُسے گہنوں سے اتنی محبت تھی۔ ساس تو مرتے دم تک نہ لے جانے دیتی۔ لیکن کھنہ صاحب اپنی ماں کو سمجھا بجھا کر لے آئے تھے۔ یہاں مریضوں کو گہنے پہننے کی اجازت نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے سمجھایا کہ انہیں ساتھ نہیں لانا چاہیئے تھا۔ اب بھی بہتر ہے کہ انہیں کھنہ صاحب کے حوالے کر دو۔ لیکن وہ گہنے اپنے پاس ہی رکھنا چاہتی تھی۔ آخر ڈاکٹر صاحب نے گہنے ایک لوہے کے صندوقچے میں بند کر کے چابی اُسے دیدی۔ اور صندوقچے کو ہسپتال کے سیف میں رکھدیا۔ اس چابی کو وہ لحظہ بھر کیلئے بھی جدا نہ کرتی تھی لیکن جب بیماری بڑھ گئی اور تن بدن کا بھی ہوش اُسے نہ رہا۔ اور جب ایکدن کھنہ صاحب کے کہنے پر میں نے اُسے سمجھایا کہ گہنے تمہارے ہی نام بنک میں جمع کرائے جا سکتے ہیں تو اُس نے چابی دیدی۔ یہ بھی ایک بات لکشمی میں مجھے عجیب نظر آئی۔ لیکن شاید انہی کے ذریعے وہ اپنے آپ کو زندہ سمجھتی تھی۔ اُسی رات اُس نے مجھے پاس بلاکر کہا تھا ـــــــ "مس صاحب اب میں بہت دیر تک زندہ نہیں ہونگی"!

سُرتی کی زبان تھرمامیٹر کی وجہ سے دُکھنے لگی تھی۔ آخر اُس نے خود ہی نکال کر مس سلطانہ کو دیدیا۔ چونک کر سُلطانہ نے تھرمامیٹر لے لیا اور ٹمپریچر دیکھنے لگی۔

سُرتی نے کہا: "یہ تو ٹھیک ہے مس صاحب، لیکن گہنے لینے کے بعد کھنّہ صاحب نے ہر ہفتہ آنا کیوں چھوڑ دیا؟ دو ہفتے گزر گئے اُنہیں آئے ہوئے"۔

رشیدہ بولی: "بیمار نہ ہو گئے ہوں۔ نہیں تو گرمی سردی، بارش، دھوپ انہوں نے کسی بات کا کبھی خیال نہیں کیا۔ باقاعدہ ہر ہفتے آتے رہے اور میں تو سوچتی ہوں مس صاحب، لکشمی کی موت کی خبر سُنکر اُنکے دل پر کیسی گذرے گی؟ اپنی بیوی سے کسی کو ہی ایسی محبت ہو گی"۔

تب شاید سٹریچر مردہ خانے میں پہنچا کر گوبند واپس آیا۔ اور اسکے پیچھے ڈاکٹر صاحب بھی آئے۔ پردے کے پاس پہنچکر گوبند نے پوچھا "کپڑوں کو لپیٹ ڈوں صاحب"۔ ڈاکٹر صاحب اُسکے پاس جاکر کھڑے ہو گئے۔ بولے۔ ہسپتال کی چادروں کو ڈس انفکٹر میں ڈال دو اور باقی کا سامان پڑا رہنے دو۔ ابھی شاید کھنہ صاحب یا اُنکا آدمی آجائے۔ ہاں گدّے یا ہو دھوپ میں ڈالدو"۔

اسی لمحے برآمدے کے پاس سیڑھیوں پر سے سائیکل پھینک کر ہانپتا ہوا پسینے سے تر لہنا سنگھ اندر آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

کیوں! کھنّہ صاحب ملے۔ بیمار تو نہیں"؟

لہنا سنگھ نے سر ہلایا۔ اُس کی سانس پھُول رہی تھی۔ جواب نہ بن پڑتا تھا۔

ذرا تلخی سے ڈاکٹر صاحب نے پوچھا "ملے یا نہیں؟ کہا نہیں تم نے کہ لاش کو

آج شام سے پہلے لے جائیں۔“

ٹھوک کر لہنا سنگھ نے کہا ”وہ تو شادی کرنے اپنے گھر چلے گئے ہیں“۔
ٹھن سے ٹمپریچر کا چارٹ مس سلطانہ کے ہاتھ سے فرش پر گر پڑا۔ اور رشیدہ
نے جیسے گھبرا کر چیختے ہوئے کہا ——— ”مس صاحب! مس صاحب!“

چلبن نگر کے چار بیکار

سُدرشن

کچھ زمانہ گزرا۔ شمالی ہندوستان میں دو پہاڑیوں کے درمیان ایک گلزار قطعہ آباد تھا جس کا نام چلبن نگر تھا۔ اسکی آبادی پانچ چھ ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ یہاں کے لوگ بالکل سادہ لوح تھے۔ ہر ایک آدمی اپنا اپنا کام خود اپنے ہاتھ سے کرتا تھا اور کسی کو کسی سے شکایت نہ تھی۔

وہاں کے لوگ دن بھر محنت مشقت کرتے تھے۔ اسلئے وہاں بیماریاں نہ تھیں۔ دوائیں نہ تھیں۔ شفاخانے نہ تھے۔ وہاں کے لوگ باہمی محبت و پیار سے رہتے تھے۔ اسلئے وہاں عدالتیں نہ تھیں۔ وکیل نہ تھے۔ جیل خانے نہ تھے۔ وہاں کے لوگ اپنی کمائی پر صابر و شاکر تھے۔ اسلئے وہاں چوریاں نہ ہوتی تھیں۔ نہ وہاں پولیس تھی۔ نہ تلواریں۔ بندوقیں اور توپیں تھیں۔ وہاں کے لوگ پرہیزگار تھے۔ اسلئے وہاں نہ فاحشہ عورتیں تھیں نہ شراب تھی۔ نہ قتل و خون کے مقدمے تھے وہاں کے لوگ انتہا درجہ کے مہمان نواز تھے! اسلئے وہاں نہ سرائیں تھیں نہ دھرم سالے تھے۔ نہ ہوٹل تھے۔ غرضیکہ وہاں کے لوگ سیدھے سادے تھے اور محنت و مشقت کے موٹے قانون کے سوائے دوسرا کوئی قانون رائج نہ تھا۔ وہ قانون یہ

تھا کہ جو محنت کرے۔ کھائے۔ جو بیکار رہے بھُوکا مرے۔ سب کام کرتے تھے صرف چار آدمی اپنے تھے۔ جن کو کام کرنے سے عار تھا۔ وہ بھُوکے مرتے تھے اور لوگوں کی خیرات پر بے شرموں کی زندگی بسر کرتے تھے۔ آخر ایک دن لوگوں نے انہیں گاؤں سے باہر نکال دیا۔ اب وہاں سب کام کرنے والے تھے۔ بیکار کوئی بھی نہ تھا۔

لیکن شیطان کو غیر مہذب؟ بیوقوفوں کی یہ چھوٹی سی دنیا پسند نہ آئی اور اُس نے عزم کر لیا۔ کہ میں اسے مہذّب بناؤنگا اور یہاں کے رہنے والوں پر اقبال اور ترقی کے دروازے کھول دونگا۔

(۲)

دوسرے دن شیطان کے حکم سے ایک خوبصورت اور متموّل سوداگر چین نگر میں داخل ہوُا اور سارے گاؤں میں گھومنے کے بعد بولا۔" افسوس! تم لوگ بالکل بدتہذیب اور گنوار ہو۔ پتہ نہیں اس حال میں تم جیتے کیونکر ہو؟"

لوگوں نے یہ فتوی(؟) سنا اور حیران ہو کر سوداگر کا منہ تکنے لگے۔

سوداگر نے کہا۔" میں نے تمام دُنیا کا سفر کیا ہے اور میں نے نہایت عجیب و غریب اشیاء دیکھی ہیں۔ لیکن ایسا مفلس اور تباہ حال گاؤں میں نے اور کہیں نہیں دیکھا!"

لوگوں نے یہ سُنا اور کہا۔" افسوس! ہمیں یہ معلوم بھی نہ تھا کیا ہم اب مہذب نہیں بن سکتے؟"

سوداگر بولا۔" مجھے چار آدمی دیدو۔ میں تمہارے گاؤں کے ایک ایک آدمی کو

مہذّب بنا دونگا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ آدمی بیکار ہوں"۔

چین نگر میں ایک بھی بیکار نہ تھا۔ لوگ مایوس ہو گئے۔ اور بولے "افسوس ہمیں معلوم نہ تھا کہ کبھی ہم کو بیکاروں کی بھی ضرورت پڑ جائے گی۔ ورنہ ہم اُنہیں گاؤں سے کبھی نہ نکالتے۔ لیکن سوداگر نے ہمّت نہ ہاری اور اپنی ملازمت کیلئے اُنہی میں سے چار آدمیوں کو منتخب کر لیا۔ اس نے کھانے کو پُر لُطف کھانے دیئے پہننے کو بیش قیمت اور خوبصورت کپڑے دیئے۔ اور کہا " جاؤ جاکر گاؤں میں سیر کرو۔ تمہارا یہی کام ہے۔" اور وہ بیکار رہ کر سارا دن گھومنے پھرنے میں ضائع کرنے لگے۔ مگر چند ہی دنوں کے بعد اُنکی طبیعت اُچاٹ ہو گئی۔ اور اُنہوں نے سوداگر سے کہا۔ "ہمیں کچھ کام دے۔ ہم بیکار نہیں رہ سکتے۔

سوداگر نے مسکرا کر اُن کی طرف دیکھا اور آہستہ سے رازداری کے لہجہ میں کہا "تم بڑے آدمی ہو۔ بڑے آدمی کام نہیں کیا کرتے۔ کام کرنا مزدوروں اور قلیوں کا کام ہے۔ بڑے آدمی چھوٹے آدمیوں سے کام کرایا کرتے ہیں"۔

چاروں بیکار یہ سُنکر کہ اب وہ بڑے آدمی بن گئے ہیں۔ خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ اور بولے " تم کتنے نیک ہو۔ تم نے ہمیں بڑا آدمی بنا دیا ہے۔ اب ہمیں در حقیقت کام کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ہم اپنا کام دوسروں سے کرا لیا کریں گے۔ لیکن ہمارے پاس اُنکو دینے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ ہم کھیتی کرتے ہیں نہ ہمارے پاس اناج ہے۔

سوداگر ایک مرتبہ پھر اپنے دلفریب انداز میں مسکرایا اور بولا تم بڑے آدمی ہو۔ بڑے آدمیوں کا کام تو لوگ مفت میں بھی کر دیتے ہیں۔ لیکن میں تمہارے لئے

دنیا کی بڑی سے بڑی رقم خرچ کرنے کو تیار ہوں۔ اس گاؤں کے لوگوں کو بلا کر ان سے کہو کہ وہ ہمارے لیئے پانچ عالیشان محل تعمیر کریں۔ ہم اُنہیں مالا مال کر دینگے۔"

(۳)

دوسرے دن سے چلین نگر کے لوگوں نے کھیتی کا کام ترک کر دیا۔ اور چار بیکاروں اور انکے مالک سوداگر کے لئے محل بنانے میں مصروف ہو گئے۔ اتنے بڑے محل اس سے پہلے وہاں کسی نے دیکھے بھی نہ تھے۔ اُنکو دیکھکر طبیعت شگفتہ ہو جاتی تھی۔ مگر انکی فصل ماری گئی۔ سوداگر نے لوگوں کو روپیہ دیا۔ لیکن روپیہ سے کسی کا پیٹ نہ بھرتا تھا۔ لوگ زار زار روتے تھے اور کہتے تھے اب کیا ہوگا؟

سوداگر نے ایک بیکار سے کہا "کچھ آدمیوں کو نوکر رکھ لے اُنکو باہر بھیج کر سستے داموں اناج خرید اور یہاں منگوا کر مہنگے داموں فروخت کر دے۔ جو بچے اُسے اپنے لئے رکھ لے۔"

بیکار نے ایسا ہی کیا اور یہ پہلا موقعہ تھا۔ جب چلین نگر کے لوگوں نے باہر سے آیا ہوا اناج کھایا اور کہا "یہ سوداگر کتنا نیک ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا۔ تو ہم اور ہمارے بال بچے بھوک کے مر جاتے۔"

اب اُنکو باہر کی چیزیں اچھی معلوم ہونے لگیں اور اناج منگوانے والے بیکار نے کئی دیگر اشیاء منگوانی شروع کر دیں۔ کچھ ہی مہینوں میں وہ امیر بن گیا اور اس نے کئی دکانیں کھولکر اُن پر اپنے کارندے بٹھا دیئے۔ وہ خود اپنے ہاتھ سے کوئی کام نہ کرتا تھا۔ اُس کے سب کام دوسرے لوگ کرتے تھے۔

دوسرے سال جب فصل کھڑی تھی۔ تو ایک رات کچھ ہرن آئے اور فصل کا

کچھ حصہ خراب کر گئے۔ سوداگر نے گاؤں کے لوگوں کو گاؤں کے چوک میں جمع کیا اور کہا "اسطرح تو یہ جانور تمہاری تمام فصل خراب کر ڈالیں گے۔ اگر تم کہو۔ تو میرا آدمی ایسا انتظام کر سکتا ہے۔ کہ آئندہ یہ ہرن تمہارے کھیتوں کے پاس نہ پھٹک سکیں"۔

چین نگر کے لوگوں نے کہا "دیکھو یہ شخص کتنا رحمدل ہے اگر یہ نہ ہوتا۔ تو ہمارے کھیتوں کو ہرن اور دوسرے جانور چیر جاتے"۔

دوسرے دن دوسرے بیکار نے گاؤں کے کچھ آدمیوں کو لاٹھیاں دے کر کھیتوں کی حفاظت کے لئے کھڑا کر دیا۔ جب فصل کٹ گئی۔ تو اپنے آدمیوں سے کہا نصف اناج میرے پاس اُٹھا لاؤ۔ نصف اُنکے لئے رہنے دو۔ نوکروں نے تعمیل کی بیکار نے تین حصے اپنے لئے رکھ لئے۔ ایک حصہ نوکروں کو بانٹ دیا۔

یہ پہلا موقعہ تھا۔ جب چین نگر کے لوگوں نے دوسروں کی حفاظت کا آرام محسوس کیا اور یہ سوچنے کی بھی ضرورت نہ سمجھی کہ ہرن کیا کھا جاتے ہیں اور اب ہم نے کتنا دیا۔

(۴)

لیکن لوگوں کو جو اناج ملا وہ انکی ضرورت سے کم تھا۔ چین نگر میں چوریاں ہونے لگیں۔ کھیتوں کے نام نہاد محافظ نے لوگوں سے کہا "اگر تم کہو۔ تو میں اپنے آدمیوں کو تمہارے مکانوں پر پہرہ دینے کا حکم دیدوں۔ پھر کیا مجال۔ جو تمہارا ایک سیر بھی اناج چوری چلا جائے"۔

گاؤں والوں نے کہا "بڑی خوشی سے"۔

پس مکانوں اور دکانوں پر پہرے دار کھڑے ہو گئے۔ چوری بند ہو گئی مگر حفاظت کرنے کے اخراجات جو لوگوں کو برداشت کرنے پڑے۔ وہ چوری کے نقصان سے کئی گنا زیادہ تھے۔

اِسطرح دوسرے بیکار کا کاروبار بھی دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگا چند ہی مہینوں میں اُس نے بھی اپنے کئی محل کھڑے کر لیئے۔ مگر وہ خود اپنے ہاتھ سے کوئی کام نہ کرتا تھا۔ اُسکے سب کام دوسرے لوگ کرتے تھے۔

کبھی وہ دن تھا۔ جب چین نگر میں سب غریب تھے۔ لیکن کھانے پینے کی کسی کو پرواہ نہ تھی۔ اب کاروبار ترقی پر تھا۔ لیکن لوگ بھوکے مر رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے۔ وہ پیار، وہ محبّت و خلوص نہ معلوم کہاں چلا گیا؟ اب لوگوں کو ایک دوسرے سے ذرا بھی ہمدردی نہ تھی۔ بات بات میں سر پھٹول ہوتا تھا۔ آج یہ زخمی ہو گیا۔ کل وہ مارا گیا۔ چین نگر میں بے چینی کا دَور دورہ تھا۔ سوداگر نے یہ حالِ زبوں دیکھا اور لوگوں سے کہا "اگر تم نے اِن شکایتوں کا سِدّباب نہ کیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ تمہارا قدیم اور خوبصورت شہر برباد ہو جائیگا۔ کیا تم کوئی ایسا معقول انتظام نہیں کر سکتے۔ کہ ایسی مہلک وارداتیں ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں"۔

لوگوں نے سوداگر کی طرف دیکھ کر سر جھکا لیا اور دھیرے سے کہا "آپ دانا ہیں کچھ آپ ہی بندوبست کر دیں۔ ورنہ ہم سچ مچ برباد ہو جائیں گے"۔

سوداگر نے جواب دیا "اچھا ہم سوچیں گے"۔

دوسرے دن ایک مہاجن اور ایک کسان میں جھگڑا ہو گیا۔ مہاجن کہتا تھا اس کے

ذمہ میرا بیس سیر اناج نکلتا ہے۔ کسان کہتا تھا یہ جھوٹا ہے۔ میں نے اس سے صرف دس سیر اناج لیا تھا۔ دونوں لڑتے تھے، جھگڑتے تھے۔ اور ایک دوسرے کو گالیاں دیتے تھے۔ ایک دُکاندار نے یہ دیکھا اور جاکر سوداگر کو اطلاع دیدی۔ سوداگر نے اسی وقت ایک آدمی بھیج کر دونوں کو اپنے پاس بُلایا اور تیسرے بیکار سے کہا "اِنکے جھگڑے کا تصفیہ کر دو"۔

بیکار نے دونوں کی بات چیت سُنی اور پھر کِسان سے کہا "تو نے اس سے بیس سیر اناج بھی لیا ہے اور اسے گالیاں بھی دی ہیں۔ اسلئے میرا فیصلہ یہ ہے کہ تو پچیس سیر اناج دے"۔

مہاجن نے خوش ہو کر کہا "کیسا عمدہ فیصلہ ہے۔ بیس سیر نہ دیتا تھا۔ اب پچیس سیر دینا پڑا۔ اسکی یہی سزا تھی"۔

کِسان نے مجبوراً پچیس سیر اناج منگوا کر سامنے رکھ دیا۔

اب بیکار مہاجن سے مخاطب ہُوا اور بولا "تیرے پاس کیا ثبوت ہے کہ تو نے اس شخص کو بیس سیر اناج دیا تھا۔ وہ کہتا ہے۔ میں نے دس سیر لیا تھا"۔

مہاجن چپ چاپ کھڑا زمین کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔

بیکار نے کہا۔ تو صرف دس سیر اناج کا حقدار ہے؟ اس سے زیادہ تجھے ایک دانہ بھی نہیں مِلسکتا۔ لیکن تو نے اسے گالیاں دی ہیں۔ اور شہر کے لوگ اسکی شہادت دینے کو تیار ہیں۔ گالیاں دینے کا تجھے کوئی حق نہ تھا۔ کیا تیرے پاس اسکا کوئی جواب ہے؟

مہاجن چپ چاپ کھڑا زمین کی طرف دیکھتا رہا۔ اسکے پاس کوئی جواب نہ تھا۔
بیکار نے کہا میرا فیصلہ یہ ہے کہ تجھے پانچ سیر اناج دیا جائے۔ باقی پانچ سیر
جرمانہ کے طور پر کاٹ لیا جائے۔"
مہاجن انکار نہ کر سکا۔
کسان نے خوش ہو کر کہا "کیسا عمدہ فیصلہ ہے۔ دس سیر نہ لیتا تھا۔ اب
پانچ سیر لینا پڑا۔ اسکی یہی سزا ہے۔"
لوگوں نے اس فیصلہ کے دلچسپ حالات سنے تو کہا "ہم کیسے خوش نصیب ہیں۔
اگر یہ شخص نہ ہوتا تو ہم لڑ لڑ کر مر جاتے۔"
اسطرح تیسرے بیکار کا کاروبار بھی چل نکلا۔ اور اسکے پاس بھی کئی عالیشان
اور فلک بوس محل ہو گئے۔ مگر وہ بھی کوئی کام اپنے ہاتھ سے نہ کرتا تھا۔ اسکے
سب کام گاؤں کے دوسرے لوگ کرتے تھے۔

(۵)

لیکن ابھی چوتھا بیکار غریب تھا۔
سوداگر نے اس کے لئے کمائی کا ذریعہ پیدا کرنے کی بہت کوشش کی۔ سوچ
سوچ کر اسکے سر میں درد ہونے لگا اور اسکی کن پٹیاں پھٹنے لگیں۔ لیکن اسے اس
تاریکی میں کوئی رستہ نہ سوجھا۔ آخر ہار کر وہ اپنے مربی و آقا شیطان کے پاس گیا اور
تین سال کی کارگزاری سنا کر بولا "گاؤں کی تین چوتھائی آبادی پر ہمارا قبضہ ہو چکا
ہے۔ لیکن ابھی ہمارا چوتھا بیکار خالی بیٹھا ہے۔ اگر اسکے لئے کوئی موزوں کام نکل آئے
تو یقیناً چین نگر کا ایک ایک آدمی ہماری مٹھی میں ہو گا۔

شیطان نے اپنے نائب کی پیٹھ پر آہستہ سے تھپکی دی اور اپنی گول گول اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے اسکی طرف دیکھ کر کہا "جاؤ جا کر وہاں لوہے کی ایک چکّی لگا دو۔ باقی میں خود سمجھ لونگا"

چند دن کے بعد چَین نگر کے باہر ایک وسیع میدان میں لوہے کی چکی لگ گئی اور رات کے وقت شیطان نے آکر اپنی شیطانی طاقت اُسمیں داخل کر دی۔ دوسرے دن چکّی نے گیہوں اور باجرہ اور مکّی اور چنے پیسنا شروع کر دیا اور یہ آٹا اتنا مہین اور اتنا نفیس تھا کہ گاؤں کے گنوار لوگ دیکھکر حیران رہ گئے انہوں نے ایسا آٹا کبھی نہ کھایا تھا۔ ایک ہی دن میں چین نگر کی سینکڑوں پتھر کی چکیاں بیکار ہو گئیں اور ایک ہی دن میں چین نگر کی سینکڑوں غریب عورتیں اور بن باپ کے بچے بھوکے مرنے لگے۔ لیکن اور لوگ خوش تھے اور اپنی خوش بختی پر پھولے نہ سماتے تھے۔ چوتھا بیکار سامنے تخت پوش پر بیٹھ کر حقّہ پیتا رہتا تھا۔ اور رات کے وقت اتنا کما کر اُٹھتا تھا۔ جتنا قصبہ کا کوئی کام کرنے والا نہ کماتا تھا۔ اُس نے سوداگر کے مشورہ سے کئی اور کلیں لگائیں اور گاؤں کے کئی اور مزدوروں کو بھی دانے دانے کا محتاج کر دیا۔

اسطرح شیطان کی مہربانی سے چوتھا بیکار بھی چند ہی دنوں میں دولتمند ہو گیا لیکن وہ بھی اپنا کوئی کام اپنے ہاتھ سے نہ کرتا تھا۔ اُسکا سب کام گاؤں کے دوسرے لوگ کرتے تھے۔

چَین نگر آج بھی اُن پہاڑیوں کے درمیان اسیطرح آباد ہے۔ اب وہاں دیکھنے کے قابل کئی عمارتیں بن گئی ہیں۔ وہاں عدالتیں ہیں۔ وہاں شفاخانے ہیں

وہاں سرائیں اور دھرمسالے ہیں۔ بڑے بڑے کارخانے ہیں۔ اُونچے اُونچے محل ہیں اگر کوئی مسافر اُدھر جا نکلتا ہے تو اس شہر کی عظمت دیکھ کر اُسکی طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ اسکے دل کا کنول کھل جاتا ہے۔ لیکن اب وہاں کا قانون تبدیل ہو گیا ہے۔ پہلے سب کام کرنے والے کھاتے تھے۔ صرف چار بیکار بھوکے مرتے تھے۔ اب چار بیکار عیش کرتے ہیں۔ باقی سب کام کرنے والے بھوکے مرتے ہیں:۔

صحرائی

رنبیر سنگھ ویر

ہیلو۔ ہیلو۔۔۔۔ کیا یہ پیام وطن کا دفتر ہے؟ آپ ہیں؟ السلام علیکم ایڈیٹر صاحب! ہاں۔ ہاں۔ میں ہی ہوں۔ امیر حسن ڈپٹی کمشنر۔۔۔۔ نہیں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ آپ کے اخبار کی آج اشاعت میں ایک نظم شائع ہوئی ہے "جنون صحرائی"! نیچے لکھا ہے۔ از جناب صحرائی۔ یہ صحرائی کون ہے؟ نہیں کوئی خاص بات نہیں۔ میری لڑکی امینہ ہے نا۔ آپ نہیں جانتے وہ اس بار بی۔ اے میں اردو میں اوّل رہی ہے۔ ہاں وہی۔۔۔۔ اُس نے اس نظم کو پڑھا۔ میرے پاس لائی۔ میں نے پڑھا۔ کچھ شوق رکھتا ہوں۔ ہاں۔ آپ لوگوں کی نوازش ہے، اوہ! نہیں۔ من آنم کہ من دانم۔ لیکن نظم خوب لکھی ہے۔ سوچا آپ سے دریافت کر کے صحرائی صاحب کو گھر بلائیں۔ کچھ اور کلام سنیں۔۔۔۔ ہیں؟ کیا کہا؟ افسوس ہے۔ پھر کیا ہو سکتا ہے۔ پر انہوں نے اپنا پتہ نہیں لکھا۔ لفافہ نہیں دیکھا آپ نے پھینک دیا؟ لکھنا خوب ہے۔ اچھا کبھی پتہ لگے تو مجھ سے فرمائیگا۔ وعلیکم السلام۔۔۔۔ ۔۔۔۔ شکریہ۔ مہربانی۔

اور ٹیلیفون کا چونگا ہاتھ سے رکھتے ہوئے مسٹر امیر حسن نے کہا۔ "صحرائی کا کچھ

پتہ نہیں لگتا۔ معلوم ہوتا ہے۔ امینہ! وہ کوئی معمولی شاعر ہے۔ ایک اچھی نظم کہہ دی ہے۔ ورنہ ہمیشہ اچھی نہیں کہتا ہوگا۔ اسی لئے ادبی دُنیا اس سے متعارف نہیں ہے"

امینہ نے آہستہ سے کہا "میں تو ایسا نہیں سمجھتی ہوں ابّا مجھے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آدمی ہمیشہ ہی سے اچھا لکھتا رہا ہے۔ آپ اسکے خیالات نہیں دیکھتے ہیں؟ یہ تخیّل ایک دن میں پیدا نہیں ہوتا۔ یہ جذبات ساون کے بادلوں کی طرح آسمان سے دل میں نہیں آتے۔ جنون صحرائی۔ دنیا کے اعلیٰ ترین گیتوں میں سے ہے"

امیر حسن اِن چند ہندوستانیوں میں سے تھے جنہیں ڈپٹی کمشنر بننے کا نصیب حاصل ہوا ہے۔ لیکن شعر و شعریت سے اُنہیں ایک عجیب اُنس تھا۔ اس لئے بیٹی کو اس طرح کی شاعرانہ گفتگو کرتے سُنکر انہوں نے پُر تعریف نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا۔ "تم اُردو ادب کے اوّل ترین مبصّروں میں ہوگی"

امینہ نے لجا کر کہا "پیشگوئی دنیا کا آسان ترین شغل ہے"

اور وہ ہنس پڑی۔

اور امیر حسن بھی ہنسنے لگے۔

(۲)

لیکن ڈپٹی کمشنر امیر حسن اور انکی بیٹی امینہ ہی صحرائی کے لئے بیقرار ہو یہ بات نہ تھی۔ شہر میں کتنے ہی آدمی اُسکے لئے بیتاب تھے۔ "پیام وطن"

ایڈیٹر مسٹر قدوائی ٹیلیفون کی گھنٹی سنتے سنتے تنگ آ گئے تھے۔ ہر بار وہی سوال ہوتا تھا۔ یہ صحرائی کون ہیں؟ اور ہر بار مسٹر قدوائی افسوس کے ساتھ کہتے تھے میں جانتا نہیں ہوں۔ لفافے میں ایک نظم آئی تھی۔ شائع کر دی۔ ہاں لکھتا بہت اچھا ہے۔ ہاں۔ ہاں۔ کمال کر دیا ہے۔

لیکن قدوائی بہت تنگ نہیں آتے تھے۔ جتنے زیادہ سوال ہوتے تھے۔ اتنی ہی مسرت ہوتی تھی۔ انکے اخبار میں ایک ایسی چیز شائع ہوئی تھی۔ جسکے لئے شہر کا شہر بیتاب ہو اُٹھا تھا۔ کیا یہ فخر کی بات نہ تھی۔ مگر وہ خود اپنے آپ سے سوال کرتے تھے "یہ صحرائی کون ہے"؟

تب انہیں ایک بات یاد آئی۔ اُٹھ کر ردی کی ٹوکری کے پاس گئے۔ پرانے کاغذوں میں اس لفافے کو تلاش کرنے لگے۔ جسمیں وہ نظم آئی تھی۔ لیکن کافی دیر تک مغز پچی کرنے پر بھی وہ لفافہ نہیں ملا۔

تب انہوں نے افسوس کیساتھ کہا۔ صحرائی پیدا بھی ہوا اور مر بھی گیا۔ اب شاید اسکی کوئی نظم نہیں آئے گی"!

لیکن ایسا ہوا نہیں۔ دوسرے ہفتے سنڈے ایڈیشن شائع ہونے سے ایک دن پہلے" پیام وطن کے دفتر میں ایک لفافہ آیا اس پر ٹوٹے حروف میں لکھا تھا:۔

مدیر" پیام وطن"

لاہور

اور لفافے کے ایک کونے میں لکھا تھا:۔

از" صحرائی"

مسٹر قدردائی نے بیتابی سے لفافہ کھولا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے۔ اس میں ایک اور نظم تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نہایت نازک ہاتھ سے اسے لکھا ہو۔ حروف کی بناوٹ میں ایک حُسن تھا۔ ایک معصومیت سی تھی۔

لکھا تھا:۔

"خدمت میں یہ ناچیز اشعار ارسال ہیں۔ آپ نے پچھلے اشعار کی قدر افزائی کی تھی اسی لئے انکو بھی ارسال کرنے کی جرأت کی گئی ہے۔ فقط

ممنون

"صحرائی"

اور اس خط کے ساتھ ایک نظم تھی۔ جسکے اشعار تو اب بھول گئے ہیں لیکن خیالات اب بھی لوگوں کو یاد ہیں۔ کچھ اس طرح کے خیالات تھے۔

وہ شباب کے گناہ کی طرح حسین تھی۔ اور فراق دوست کی طرح دلسوز۔ اسکی آواز میں موسیقی تھی۔ اور موسیقی میں شراب۔ اُسکی آنکھوں میں پھُول تھے۔ اور پھولوں میں سانپ۔ وہ رقاصہ تھی—! قدردائی نے پڑھا اور جھُوم گئے بار بار پڑھنے لگے" وہ شباب کے گناہ کی طرح حسین تھی اور فراق دوست کی طرح دلسوز، اُف! کیا تخیل ہے؟ کیا سادگی ہے؟—شباب کے گناہ کی طرح حسین—!"

اور دوسرے دن شہر بھر جھوم رہا تھا۔ "پیام وطن" کا سنڈے ایڈیشن صبح ۴½ بجے شائع ہوا۔ اور پونے سات بجے دفتر میں ایک بھی کاپی نہ تھی۔ فائلوں تک میں پرچے نہیں ڈالے گئے تھے۔ اور اب بھی مانگ تھی۔ مینجر نے تنگ آ کر

اپنے ٹیلیفون کا چونگا اتار کر نیچے رکھ دیا۔

اور شہر میں ہر آدمی کی زبان پر صحرائی کی نظم تھی۔ صحرائی۔ صحرائی چاروں طرف سے سنائی دے رہا تھا۔ لوگ اسکی نظم کو پڑھ پڑھکر جھوم رہے تھے۔ اور جھوم جھوم کر پڑھ رہے تھے۔

(۳)

امینہ جلدی سے ڈپٹی کمشنر صاحب کے کمرے میں آئی۔ اور بولی "آپ نے دیکھا ہے؟"

امیر حسن نے پُر تحسین نگاہوں دیکھتے ہوئے کہا "دیکھا ہے۔ اس بار اس نے پہلے سے بھی کمال کر دیا ہے پتہ نہیں وہ انسان ہے کہ جادوگر ۔۔۔۔۔"

امینہ نے ہنس کر کہا "لیکن سب سے بڑا کمال یہ ہے۔ کہ وہ دُنیا کو شعر سے منور کر رہا ہے۔ مگر خود چھپ گیا ہے۔ میں سمجھتی ہوں۔ ابّا صحرائی کے پایہ کا شاعر ان دنوں اس ملک میں اور نہیں ہے"۔

امیر حسن نے کہا "ہاں۔ جہاں کہیں بھی وہ ہے۔ جو کوئی بھی وہ ہے۔ وہ لاثانی شاعر ہے۔ مگر دیکھو امینہ ! ــــ شاید اس بار فدرروائی کو کچھ معلوم ہوا ہو"۔ "ہاں ہاں" امینہ نے کہا۔ "دریافت تو کیجئے"۔

لیکن ڈپٹی کمشنر صاحب کا چہرہ افسردہ دیکھکر امینہ نے سمجھ لیا۔ کہ ٹیلیفون پر کوئی بھی مفید مطلب اطلاع نہیں ملی۔ امیر حسن نے دھیرے سے کہا "مسٹر فدرروائی کہتے ہیں۔ پہلے میرا خیال تھا کہ وہ مرد ہے۔ لیکن اب میں اس بات کو بھی توثق

سے نہیں کہہ سکتا کہ صحرائی مرد ہے یا عورت۔ ہاں وہ نہایت نازک دستخط کا شخص ہے جو کوئی ہے۔ نفاست اس میں کوٹ کوٹ بھری ہے۔

املینہ نے آہستہ سے کہا۔ میں تو پہلے ہی سمجھتی تھی۔ اس کے خیالات کتنے نازک ہیں۔ لیکن وہ مرد ہے یا عورت۔ اس کے متعلق میں جانتی ہوں۔ کہ وہ کیا ہے.......؟"

امیر حسن "۔ کیا ہے ؟"

املینہ۔ ابھی نہیں۔ ابھی نہیں بتاؤں گی۔ دو چار دن ٹھہر جائیے!...... اگر میں مصورہ ہوتی۔ تو آج صحرائی کی تصویر کھینچ کر بتا دیتی کہ یہ صحرائی ہے لیکن ابھی نہیں......!"

(۷)

سوموار کو "پیام وطن" میں ایک نوٹس تھا۔ جلی حروف میں لکھا تھا:۔

صحرائی!

آپ کی وہ نظمیں" پیام وطن" میں شائع ہو چکی ہیں۔ آخری نظم" رقاصہ کے عنوان سے"! ادبی دنیا آپ کا نیاز حاصل کرنے کے لئے بیتاب ہے۔ لیکن کسی کو آپ کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ اسلئے آپ جہاں کہیں بھی ہیں۔ براہ کرم۔ پیام وطن کے دفتر میں یا خود تشریف لانے کی تکلیف گوارا کیجئے۔ یا اپنا پتہ ارسال کیجئے۔ ہم جانتے ہیں۔ باکمال لوگ عوام کے سامنے آنا پسند نہیں کرتے۔ لیکن اس تعارف کے لئے ادبی دنیا آپ کی بے حد ممنون ہوگی۔

قدر وائی مدیر" پیام وطن"

اس نوٹس کا کافی دیر تک کوئی جواب موصول نہیں ہُوا۔ قدر روائی کی منتظر نگاہوں نے کسی بھی نحیف و لاغر شاعر کو "پیامِ وطن" کے دروازے سے اندر آتے اور میں صحرائی ہوں۔ قدر روائی کو ملنا چاہتا ہوں۔ کہتے نہیں دیکھا۔ جیسے جیسے دن گزرتے جاتے تھے۔ قدر روائی کی اُمیدیں خاک میں ملتی جاتی تھیں۔ بار بار وہ امینہ کو جواب دیتے تھے۔ نہیں۔ ابھی تک کوئی جواب نہیں آیا۔ نہیں۔۔۔۔ پتہ نہیں اب کیا کر سکتا ہوں۔۔۔۔

لیکن شکر وار کو دفتر میں پھر ایک لفافہ موصول ہُوا۔ اسی زنانہ سے نازک دستخط میں۔ قدر روائی نے اُسے دیکھا۔ تو خوشی سے اُچھل پڑے لیکن اُسے کھولنے سے پہلے جلدی سے ٹیلیفون کے چونگے کو اُٹھایا۔ ڈائل کو گھمایا اور کہا ـــ ہیلو ہیلو مس امینہ!۔۔۔ ہاں۔۔۔ مس امینہ کو بلا دو بھائی ـــ نہیں جلدی سے بلا دو۔ میں نید نہیں کرتا ہوں۔ جلدی کر دو ـــ ہاں۔ ہاں۔ میں ہوں قدر روائی۔ صحرائی کا خط آ گیا ہے۔ بیتاب نہیں ہو جیئے۔ ابھی میں نے خود بھی پڑھا نہیں ہے۔ نظم کا پتہ نہیں۔ کھولا بھی نہیں ہے۔ لیجئے کھولتا ہوں ہاں وہی لکھا ہے۔ مشفق مدیر صاحب! عزت کا ممنون ہوں۔ مجھ غریب کو شہرت کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ ہی میں اپنے آپ کو شاعر سمجھتا ہوں۔ ہاں۔ ہاں۔ یہی لکھا ہے۔ نہ میں اپنے آپ کو شاعر سمجھتا ہوں۔ آجکل کشمیر میں رہتا ہوں۔ ہاں کشمیر میں۔ آج یہاں ٹٹن سے یہ مراسلہ پوسٹ کرتا ہوں۔ کل کہاں ہونگا۔ اس کا مجھے خود علم نہیں ہے۔ کبھی واپس آیا تو نیاز حاصل کرونگا۔ ایک گیت ارسال ہے۔ میں نے تو عنوان رکھا ہے "پیامِ وطن" اگر یہ اچھا نہ ہو۔ تو ادریکھ

لیجئے۔ آپ کا ممنون ہوں۔۔۔۔ صحرائی از ٹیٹن کشمیر۔۔۔ ہیلو —— اور اسکے ساتھ یہ گیت ہے۔ ہاں سُناتا ہوں۔ ہیلو۔ ہیلو —— مس ایدنہ —— ہیلو —— لیکن چونگے کو ملا کر مسٹر قدردانی نے دیکھا۔ کہ ٹیلیفون کی بجلی ختم ہو گئی ہے۔

اور دوسرے دن سنڈے ایڈیشن میں موٹے حروف میں ایک چار کالمی سُرخی تھی

مشہور شاعر صحرائی۔ آجکل کشمیر جنت نظیر میں

سیر و سیاحت کر رہے ہیں

دنیا کے محبُوب ترین شاعر کا آخر کار پتہ چلا

صحرائی کہتے ہیں میں شاعر نہیں

اِن عنوانات کے نیچے صحرائی کا مکتوب تھا۔ اس کے بعد وہ گیت تھا جس کا عنوان تھا "پیامِ وطن" اِس کے بھی اشعار تو بھول گئے ہیں۔ مطلب کچھ اس طرح تھا:۔

پژمردہ پھولوں میں اس کی بوڑھی آنکھیں ہیں۔ جو شبنم کے آنسوؤں سے چپ ہیں۔

آبشاروں کے روتے ہوئے گیتوں میں اسکی صدائیں ہیں۔ جو چٹانوں کے بڑھاپے میں ڈگمگا رہی ہیں۔

خزاں کے اشجار کی شاخوں میں اس کی اُنگلیاں ہیں۔ جو ہوا کی ضعیفی میں کانپ رہی ہیں۔

اُسے اپنے عزیز بچّوں کا خون درکار ہے۔

کوئی ہے ؟ —— ؟

اور اس کے نیچے ایڈیٹر کی طرف سے ایک اور نوٹس تھا۔

آفتاب ادب صحرائی!

آپ کے مکتوب گرامی سے آپ کا کچھ خاص پتہ نہیں چلا۔ آپ کشمیر میں تو ہیں۔ پر کہاں ہیں؟ دنیا آپ کے لئے بیقرار ہے۔ اس پہ رحم کیجئے اور لاہور میں آجائیے!

مدیر "پیام وطن"

(۶)

اور اس وقت انجمن ادب میں بھی صحرائی کا ہی چرچا ہو رہا تھا! انجمن کے صدر مسٹر عبداللہ کہہ رہے تھے۔

ہاں۔ تو آج کے جلسے میں انجمن نے فیصلہ کیا ہے۔ کہ ہر پانچ برس کے بعد انجمن کی طرف سے بہترین ادبی چیز پر جو دس ہزار کا انعام دیا جاتا ہے۔ وہ اس بار اس عجیب شخص صحرائی کو دیا جائے۔ ...... لوگوں کی کئی سو صفحات کی کتابیں اس کی چند سطری نظموں کے سامنے ہیچ سمجھی گئی ہیں ——"

"لیکن اس کا تو کچھ پتہ نہیں چلتا"؟

یہی تو ہم بھی سوچ رہے ہیں کہ اسے انعام کیسے دیا جائے "پیام وطن" میں شائع کرا دیں گے۔ امید ہے وہ آجائے گا۔

لیکن میں تم سے ایک بات کہوں۔ عبداللہ! میرے خیال میں یہ صحرائی کوئی بہت بڑا اسٹری سودائی دیوانہ وحشی سا آدمی ہے"۔

اور تم کیا سمجھتے ہو کہ تمہاری طرح وہ پنجاب کی حسین ترین آنکھوں کا مالک ہے،

تمہاری ہی طرح عورتیں اسکے لئے مرتی ہیں خاور بھائی! وہ تو ویسا ہی ہوگا جیسے شاعر ہوتے ہیں۔ لاپرواہ ——— پاگل ——— سودائی ——— "

لیکن عبداللہ اس پاگل سودائی کو اتنی عزت اور اتنے روپے کی کیا ضرورت ہے"؟

"پھر کس کو ضرورت ہے"!

"مجھ کو"!

"تم کو۔ خاور"؟

ہاں مجھ کو۔ میری بات سنو۔ میں صبح سے سوچ رہا ہوں۔ کہ میں چپکے سے کشمیر چلا جاؤں۔ وہاں سے پیامِ وطن والوں کو خط لکھ دوں۔ کہ میں آپ کی خواہش کے مطابق واپس آ رہا ہوں۔ تم لوگ استقبال کے لئے سٹیشن پر آنا اور ٹرین آنے سے تھوڑی دیر پہلے ان کو بتا دینا کہ صحرائی دراصل کون ہے مجھے دیکھتے ہی وہ لوگ نعرے لگائیں گے۔ میں کہوں گا۔ کہ میں نے عبداللہ سے کہہ دیا تھا کہ میرے پہنچنے سے پہلے وہ کسی کو اس راز سے آگاہ نہ کرے ——— اور پھر ———

"پھر دولت اور عزت تمہارے پاؤں چومے گی لیکن یہ اچھا نہیں ہے خاور! تمہارا وعظ سننے کو میں یہاں نہیں آیا۔ تم میرے دوست ہو میں تمہاری مدد چاہتا ہوں"۔

خاور ان لوگوں میں سے تھا۔ جن کی بات سے انکار کرنا مشکل نہیں ناممکن ہوتا ہے۔ عبداللہ نے دھیرے سے سر ہلا دیا۔ اور کہا "جو مزاج یار میں آئے"۔

مندرجہ بالا واقعہ کے کوئی سات دن بعد پیام وطن کے دفتر میں ایک خط موصول ہوا۔ ان ہی پرانے نازک سے دستخطوں میں۔ جن کے الفاظ نہایت بنا بنا کر لکھے گئے تھے۔ جیسے کسی نوجوان لڑکی نے اپنے محبوب کو لکھے ہوں لکھا تھا۔

"دوست!

خدمت میں ایک آبشار ارسال ہے۔ لاہور آنے کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر آؤنگا۔ تو آپ کو اطلاع دونگا۔

صحرائی"

قدرداں نے اپنے ابا کو ٹیلیفون پر "آبشار" سنایا۔ اس نے کہا۔ میں جیران نہیں ہوں۔ وہ آدمی دنیا کا بہترین شاعر ہے۔ اگر وہی ایسی چیزیں نہ لکھیگا۔ تو اور کون لکھے گا۔ اور پھر اس نے جا کر ڈپٹی صاحب سے کہا۔ آبا جی! اس دن میں نے کہا تھا کہ صحرائی کی تصویر کھینچ سکتی ہوں۔ آج بتاؤں وہ تصویر کیسی ہے؟

ڈپٹی کمشنر نے دھیرے کہا "بتاؤ!"

البیلہ نے کہا "آبا جی! وہ ایک نہایت خوبصورت آدمی ہے۔ اسکی آنکھیں حسن سے مخمور ہیں۔ اور اسکی آواز مستانگی لئے ہے۔ اسکا دل کسی ناکام محبت سے بھرا ہے اور اگر وہ اتنے اعلیٰ پایہ کا شاعر نہ ہوتا تو اب تک مر چکا ہوتا۔

جس وقت البیلہ جوش کے ساتھ ان الفاظ کو کہہ رہی تھی اسیوقت ڈپٹی کمشنر مسٹر حسن نے دیکھا۔۔۔۔ انکی بیٹی کی آنکھوں میں اس نامعلوم شاعر

صحرائی کی محبت رقصاں ہے۔

اور میر حسن نے کچھ غلط نہیں سمجھا تھا۔ کتنے ہی دن سے امینہ اس خوبصورت آدمی کے خواب دیکھ رہی تھی۔ جو کشمیر کی وادیوں میں ایک خوش الحان بلبل کی طرح گاتا پھرتا ہے۔ جس کی صدا میں سوز ہے۔ جسکے اشعار میں حسن ہے۔ جسکی آنکھوں میں لا انتہا شراب ہے۔

جس "آبشار" کو شنکر امینہ نے صحرائی کی تصویر مکمل کی تھی۔ وہ عام زبان میں کچھ اس طرح تھا:۔

تم کون ہو؟
کس کی یاد تمہیں رات سے دن تک اور دن سے رات تک رلایا کرتی ہے؟
ان پتھروں، چٹانوں۔ جھاڑیوں اور بیلوں کے پیچھے تم کسے تلاش کرتے پھرتے ہو؟
کیا تمہیں بے وفا سے اُلفت ہو گئی ہے؟

آبشار موصول ہونے کے تین دن بعد "پیام وطن" کے دفتر میں ایک اور لفافہ آیا۔ تھا تو کشمیر سے۔ لیکن دستخط صحرائی کے نہ تھے۔ قدروائی نے کھولا۔ پڑھا لکھا تھا:۔

مسٹر قدروائی!

آپ میرے دستخط دیکھکر حیران ہونگے۔ لیکن یہی میرے اصلی دستخط ہیں میں خود ذرا لکھنے سے جی چراتا ہوں اسلئے پہلے خطوط اپنے سکرٹری سے لکھواتا تھا۔ آج اس سکرٹری کو ایک خاص وجہ سے نکال دیا ہے۔ نیا سکرٹری ابھی

کوئی نہیں ملا۔ اسلئے خود ہی اس خط کو لکھ رہا ہوں۔ سکہ ٹری کا دستخط تو اچھا تھا لیکن وہ کچھ خبطی سا آدمی تھا۔ اچھا تو میں آپ کو بتلاؤں۔ آپ مجھے جانتے ہیں لاہور کے اور بھی کئی اصحاب کمترین سے واقف ہیں۔ لیکن میں کون ہوں۔ یہ لاہور میں آکر بتاؤنگا۔ لاہور کب آؤنگا۔ اسکے متعلق ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا۔ آنے سے پہلے اطلاع دونگا۔

آپ کا خیر اندیش

"صحرائی"

اس شام کو لاہور بھر کے ادبی حلقہ میں صحرائی کے متعلق اس نئی اُپج پر قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ لوگ سوچ رہے تھے۔ تو وہ ایک امیر آدمی ہے۔ سکرٹری رکھتا ہے۔ کشمیر کی سیر کرتا ہے۔ مزے سے رہتا ہے۔ اور اللہ سوچ رہی تھی۔ میرا خیال درست ہے۔ غریب آدمی اتنا خوبصورت نہیں ہو سکتا۔ اور خیال ہی میں وہ اس نامعلوم شخص سے باتیں کر رہی تھی۔ کہہ رہی تھی۔ آپ کب آئیں گے؟ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ کوئی آپکے انتظار میں بیقرار ہے؟

(۹)

تین دن بعد ایک خط موصول ہوا۔ اسی زنانہ سے نازک سے دستخط میں اس الفاظ میں جن سے موسیقی ٹپکتی تھی۔ اور شعریت برستی تھی۔ لکھا تھا:۔

"مہربان مدبرہ پیام وطن"

آپکے اصرار پر لاہور آرہا ہوں۔ لیکن دل کانپتا ہے۔ صحرائی کو شہر سے کیا رشتہ ہے۔ صحرائی کو شہرت و عزت سے کیا واسطہ ہے۔ جنگل میں۔ بیابان میں گوشہ نشین

کی فلک شگاف چوٹیاں ہیں۔ وہ دُلہنیں ہیں۔ اشجار ہیں۔ وہ سامعین ہیں آبشار ہیں وہ ساتھی ہیں۔ گھٹائیں ہیں وہ پیامبر ہیں۔ پر پھر بھی آتا ہوں دیکھوں۔ آپ لوگ کیا کہتے ہیں —— اس جمعرات کو فرانٹیر میل پر۔ امید ہے جب آپ کے دفتر میں آؤں گا۔ تو آپ اس آدمی کو پہچان سکیں گے۔ جسے آپ نے اتنا بدنام کر دیا ہے۔

صحرائی "

قدر دائی حیران ہو رہے تھے۔ کہ یہ صحرائی کو پھر کیا ہو گیا ہے۔ کیا اس نے اپنا پرانا سکر ٹری پھر رکھ لیا ہے۔ آخر بہت سوچ سوچ کر وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہی تھے۔ کہ صحرائی نے اپنے سکرٹری کو پھر رکھ لیا ہے۔ کہ تار گھر کا چپڑاسی ایک تار لیکر آیا۔ قدر دائی نے تار کو پڑھا صحرائی نے بھیجی تھی۔ لکھا تھا:—

"سب کو سلام کہئے صحرائی"

قدر دائی نے ہنسکر کہا صحرائی شاید بھول گیا ہے۔ کہ اس نے پہلے خط بھی لکھا ہے۔ اسلئے تار دے دیا ہے۔

(۱۰)

جمعرات کا دن۔ اسٹیشن پر اتنی بھیڑ تھی۔ کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی ریلوے والوں کو پلیٹ فارم ٹکٹوں کی فروخت بند کر دینی پڑی۔ لوگوں کے ہاتھوں میں ہار تھے پھولوں کے گلدستے تھے۔ وہ بیتابی سے فرانٹیر میل کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک طرف انجمن ادب کی کارکن کمیٹی کے کچھ اراکین تھے۔ قدر دائی تھے ڈپٹی کمشنر امیر حسن تھے۔ ایڈیٹر بھی۔ عبد اللہ بھی تھے۔ گاڑی آنے میں ابھی کچھ ہی دیر باقی

تھی۔ کہ عبداللہ نے ایک اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر کہا "حاضرین!"
پہلے تو کسی نے انکی آواز کو نہیں سنا۔ لیکن پھر سب نے کہا۔ چپ چپ سنو
سنو۔ اور تب عبداللہ نے کہا :۔
حاضرین! جس عظیم شاعر کا استقبال کرنے کے لئے آج ہم یہاں آئے ہیں
وہ اب تک آپ کے لئے ایک راز ہے۔ لیکن میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔ کہ
صحرائی لاہور کا ہی رہنے والا ہے۔ آپ میں سے بہت سے لوگ اس کو
جانتے ہیں۔
لوگوں نے حیرانگی سے عبداللہ کی طرف دیکھا۔ عبداللہ نے ذرا ٹھہر کر کہا۔
آپ سنکر حیران ہونگے۔ کہ صحرائی اور کوئی نہیں۔ آپ ہی کے شہر کا ایک
نوجوان ہے۔ اور اسکا اصلی تخلص خاور ہے۔
"خاور؟" کتنی ہی زبانوں نے حیرت سے کہا۔
عبداللہ نے کہا "ہاں۔ خاور۔ وہی صحرائی بھی ہے۔ وہی اس فرانٹیر میل
سے آ رہا ہے"!
اسی وقت فرانٹیر میل کی آواز آنے لگی۔ اور تھوڑی ہی دیر کے بعد گاڑی
پلیٹ فارم پر آگئی۔

سیکنڈ کلاس کے ایک کمرہ کے باہر اتنی بھیڑ تھی۔ کہ لوگ پسے جا رہے تھے۔
دروازے میں خاور کھڑے تھے۔ پھولوں سے لدے ہوئے مسکراتے ہوئے اپنی
ان حسین آنکھوں سے دلوں کو قابو میں کرتے ہوئے۔

ڈپٹی کمشنر میر حسن نے انکا ہاتھ پکڑ کر اُنہیں نیچے اُتارا اور کہا۔ آپنے ادب کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ یہ سب لوگ آپکے اشعار پڑھکر دیوانے ہو رہے ہیں لیکن مجھے یقین ہے۔ جب اُن میں سے کوئی بھی نہ رہے گا۔ جب ہم نہ رہیں گے۔ نہ آپ اُس وقت بھی لوگ آپ کی چیزیں پڑھکر سر دُھنا کرینگے۔

خاور نے خوشی سے سُرخ ہو کر سر جُھکا دیا۔

ڈپٹی کمشنر صاحب نے کہا۔ میں جانتا ہوں۔ آپ لاہور میں رہتے ہیں۔ لیکن ایک ہفتہ بھر میں آپ کو اپنے مکان پہ رکھنا چاہتا ہوں"۔

املینہ سحر کئے ہوئے کی طرح کھڑی تھی۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ شاید صحرائی انکار کر دیں گے۔

لیکن خاور سے بھی پہلے مسٹر عبداللہ نے کہا۔" اُنہیں کیا انکار ہوگا۔ نیدہ پہ دو رہ، کیوں خاور؟

خاور نے آہستہ سے کہا۔" جیسے آپ کی مرضی!"

اور اسی وقت دُور پرے گاڑی کے آخری تھرڈ کلاس کے ڈبے میں ایک پست قامت سا شخص ایک معمولی سا بستر اُٹھائے باہر نکلا۔ اسکی آنکھیں خوفناک درندوں کی سی تھیں۔ اور چہرہ ایسے تھا جیسے دُنیا بھر کی بدصورتی اس میں بھری گئی ہے۔

اُس نے ایک قلی سے دریافت کیا۔ یہ اتنی بھیڑ کاہے کی ہے؟

قلی نے مشتبہ نگاہوں سے اسکی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ایک بہت بڑا آیا ہے اسے لوانے کو شہر والے آئے ہیں۔ سرائی اسکا نام ہے۔

"صحرائی؟ شاعر صحرائی؟"

ہاں۔ہاں سرائی۔جسے ہم لوگ بیت باز کہتے ہیں۔اسی کو وہ سائرہ کہتے ہیں وہ پست قامت شخص بھیڑ کے نزدیک گیا۔ایڑیاں اٹھا کر اس نے خاور کو دیکھا اور پھر آہستہ سے کہا۔آپ صحرائی ہیں؟"

ایک بار اُس کا چہرہ سُرخ ہو اُٹھا۔آنکھوں سے خون برسنے لگے۔لیکن معاً اُس نے امینہ کو دیکھا اور جیسے یکایک سورج غروب ہو جانے سے شفق کی سرخی زرد ہو جاتی ہے۔اُس کا غصہ بھی ختم ہو گیا۔ایک بھوکے آدمی کی طرح وہ اُسکی طرف دیکھنے لگا۔تب یکایک اُس کی آنکھیں اتنی خوبصورت دکھائی دینے لگیں۔کہ بیان بھی نہیں ہو سکتیں۔

لیکن اسی وقت بھیڑ میں ہلچل مچی۔لوگ ایک طرف کو چل کھڑے ہوئے خاور بھی چلدیے۔اور اس ریل پیل میں اس پست قامت شخص کو کتنے دھکے پڑے اسکا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

(۱۱)

دوسرے دن شام کو بادل برس رہے تھے۔اور کبھی کبھی گرج سُنائی دیتی تھی۔ساون کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔خاور ڈپٹی کمشنر میر حسن کے بنگلہ میں ایک برآمدہ میں بیٹھے تھے۔میز پر کتنے ہی دعوتی خطوط تھے۔لیکن خاور کا دھیان اسوقت انکی طرف نہ تھا۔وہ سوچ رہے تھے۔کہ امینہ کتنی خوبصورت ہے؟ اسکے بال کتنے کالے ہیں؟ اُسکی زبان میں کتنی مٹھاس ہے؟ جب سے انہوں نے اسکو دیکھا تھا۔تب ہی سے پتہ نہیں اُنہیں کیا ہو گیا ہے۔وہ عزت اور شہرت کے بدلے امینہ ہی کے

بھگت ہو گئے تھے۔

اس وقت نوکر نے آکر کہا۔ آپ کے ملنے کے لئے ایک آدمی آیا ہے۔ صاحب! عجیب وحشت سی صورت ہے۔ وہ کہتا ہے۔ آپ سے ایک ضروری کام ہے۔ آپ ہی سے کہہ سکتا ہے۔

خاور نے ذرا سوچکر کہا "مجھ سے؟ وحشی سی صورت ہے؟ بھیجدو!"

تھوڑی دیر کے بعد ایک پست قامت شخص اندر آیا۔ اسکی آنکھیں درندوں کی سی خوفناک تھیں۔ اور چہرے میں عالم بھر کی بدصورتی بھری تھی۔ اسکے کپڑے دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ بہت اچھی حالت میں نہیں ہے۔

خاور نے کہا "آپ مجھے ملنا چاہتے ہیں"

نوآمدہ نے کہا "ہاں آپ ہی سے"

خاور نے اسے کرسی پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ کہا "آپ کون ہیں؟"

نوآمدہ نے آہستہ سے کہا "میں وہی ہوں جو کچھ آپ اپنے کو ظاہر کر رہے ہیں"

"کون"؟ خاور نے کرسی سے اچھل کر کہا۔

"چونکئے نہیں" نوآمدہ نے کہا "میں صحرائی ہوں۔ آپ اس امر سے بخوبی واقف ہیں۔ کہ آپ صحرائی نہیں"

خاور نے تڑپ کر کہا "تم جھوٹ بکتے ہو۔ یہاں سے نکلجاؤ"

صحرائی نے دھیرے سے کہا۔ آپ کی عزت وشہرت پانی کے ایک بلبلے کیطرح ہے۔ ذرا سی ہوا لگنے سے وہ پھٹ جائیگی۔ اگر آج ہی کوئی آپ سے نئی نظم کہنے کو کہیگا۔ تو بنا سکتے ہیں۔ آپ کیا کریں گے؟ خاور نے کچھ سوچکر کہا۔ صحرائی! میں تم

سے ایک بات دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ دنیا تمہارے لئے مر رہی ہے۔ پاگل ہو رہی ہے۔ اتنی عزت کو لے کر تم کیا کرو گے۔ مجھے اس کی ضرورت ہے۔ پہلے بھی تھی۔ اور اب تو ....

صحرائی نے جلدی سے کہا۔ میں نے اس بات پر بہت غور کیا ہے۔ اس کنگال صحرائی کو عزت و شہرت سے کچھ سروکار نہیں۔ لیکن میں یہاں یہ سوچ کر آیا ہوں کہ آپ کی اس بنی ہوئی عزت کو بگڑنے نہ دوں۔ آپ صحرائی بنے رہیئے۔ میں گیت لکھا کروں گا آپ گایا کیجیئے۔ مجھے نوکر رکھ لیجئے۔ کسی کو معلوم بھی نہ ہوگا۔ کہ آپ اصلی صحرائی نہیں ہیں۔

خاور نے کچھ سوچ کر کہا۔ میں تمہارا بہت مشکور ہوں۔ میں چاہتا ہوں۔ بچوں کی طرح رونے لگوں۔ میں کہہ نہیں سکتا۔ میں کیسے محسوس کر رہا ہوں۔ آج سے تم میرے سکرٹری ہو۔ خدا گواہ ہے۔ میں تمہیں اسکا عوض دوں گا۔

اسی شام کو خاور نے صحرائی کی لکھی ہوئی نظم مشاعرے میں پڑھی۔ نظم کا مطلب کچھ اس طرح تھا۔

خاموشیوں کے پردے میں چھپے ہوئے تم کون ہو؟
جو موسیقی کے دریا بہا رہے ہو۔
رات کی تاریکی نے چاند کو چھپا رکھا ہے۔
کوئیلوں کی کان نے ہیرے کو چھپا رکھا ہے۔ خوفناک ساگر نے موتی کو چھپا رکھا ہے
تم کو تمہارے راز نے چھپا رکھا ہے۔
خاموشیوں کے پردے میں چھپے ہوئے تم کون ہو۔

جو موسیقی کے دریا بہا رہے ہو۔

(۱۲)

دو دن اسیطرح گذر گئے۔ صحرائی آتے۔ خاور کی چھٹیوں کا جواب دیتے ایک دو شعر لکھ لاتے۔ اور اُنہیں دے جاتے۔ خاور کے پاس ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہتا
"پیام وطن" کے خاص فوٹوگرافر نے آکر انکی کئی تصاویر لیں۔ اور کئی لوگ آئے۔ انہوں نے تعریف کے پُل باندھ دیئے۔

صحرائی چُپکے سے پرے بیٹھے رہتے۔ اپنے اشعار کی تعریف ہوتے دیکھکر انہیں دل ہی دل میں جو مسرّت ہوتی وہ بیان نہیں ہو سکتی۔ کبھی کبھی جب کوئی آدمی اُنکے اشعار کا مطلب غلط سمجھتا۔ تو وہ چاہتے۔ کہ اُٹھ کر اصل مطلب کہہ دیں لیکن پھر یہ سوچکر کہ میں صحرائی نہیں ہوں۔ صحرائی کا سکہ تڑ رہا ہوں چپکے بیٹھے رہتے۔

لیکن ایک دن۔ صحرائی بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ کہ کمرے میں امینہ داخل ہوئی۔ اُسے دیکھتے ہی صحرائی کو ایسا معلوم ہُوا۔ جیسے وہ ایک خواب دیکھنے لگ گئے ہوں۔ انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔ پھر یکایک نیچے دیکھنے لگے۔ جیسے وہ بیہوش ہو رہے ہوں۔

امینہ نے جلدی سے کہا۔ صحرائی صاحب کہاں ہیں؟"

صحرائی نے اس آواز کو تخلیے سے نچلی تہوں میں چھُپاتے ہوئے کہا۔" وہ باہر گئے ہیں۔"

امینہ جلدی سے واپس چلی گئی۔ لیکن صحرائی کی دُنیا بدل گئی۔

ایک دن وہاں اسٹیشن پر بھی انہیں ایسا معلوم ہوا تھا۔ اور آج پھر یہاں ایک بار اُنکے دل میں خواہش پیدا ہوئی۔ کہ وہ اپنے آپ کو ظاہر کر دیں۔ امینہ بن جائیں! اور پھر امینہ۔ امینہ

دھیرے دھیرے اُن کے دل میں یہ خیال اتنا زبردست ہونے لگا۔ کہ وہ پاگل سے ہونے لگے۔ شہر سے دُور دریا کے کنارے جا کر کھڑے ہو گئے۔ بادلوں میں غروب ہوتے ہوئے سورج کو دیکھنے لگے۔ لیکن دل کی آگ ختم نہیں ہوئی رات کے وقت وہ واپس آئے۔ دیوانگی اب بھی قائم تھی۔ جیسے کسی نے اُن کو بہت سا نشہ پلا دیا ہو۔

میر حسن کے گھر میں ہی ایک کمرے میں وہ رہتے تھے۔ خاور کے ساتھ ہی وہ کمرہ تھا۔ واپس آئے تو اُسمیں چلے گئے۔ دیا بھی نہیں جلایا۔ چپکے سے بیٹھ رہے اُسی وقت اُنہوں نے سُنا کہ خاور کے کمرے میں کوئی باتیں کر رہا ہے! اُنہوں نے غور سے سُنا۔ وہ خاور اور امینہ تھے۔

خاور کہہ رہے تھے۔ تو کیا سچ مچ آپ مجھ سے محبّت کرتی ہیں؟

امینہ کہہ رہی تھی۔ جس کسی نے بھی آپکے اشعار پڑھے ہیں۔ وہی آپ سے محبت کرتا ہے۔ آپ شاید جانتے نہیں ہیں۔ کہ لوگ آپ کو کس محبّت بھری نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ آپ کی وہ "رقاصہ" زبان زبان پر ہے۔ آپ کا "پیامِ وطن" ہونٹ ہونٹ پر ہے۔ ان چیزوں کو لکھنے والا آدمی اگر آدمی نہ ہو کر ایک پتھر بھی ہوتا تو دُنیا اُسکے پاؤں چومتی اور۔۔۔۔۔۔۔۔

امینہ اُس سے محبّت کرتی یہی تم کہنا چاہتی ہو۔ اچھا۔ وہ دیکھو۔ وہ بجلیاں

چمک رہی ہیں۔

"جیسے جلتے ہوئے تیر چل رہے ہیں"۔

صحرائی نے سُنا تو سر پیٹ لیا۔ اُف کتنی اچھی تشبیہہ ہے اور یہ بیوقوف یہ بیوقوف خاور۔ بدذات۔ اس نے دھوکا دیکر اس غریب کو پاگل بنا رکھا ہے ایک دن جب اُسے معلوم ہوگا کہ یہ۔ غبی خاور صحرائی نہیں۔ اور یہ شعر بینند سے بالکل اُمّی ہے۔ تو۔۔۔ تو۔۔۔

صحرائی دیوانوں کی طرح۔ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر چلنے لگے۔ غصے سے جلتے ہوئے اُنہوں نے دل ہی دل میں کہا۔ اس نے مجھے تباہ کر دیا ہے صحرائی۔ صحرائی کون صحرائی ہے۔ میں صحرائی ہُوں۔ میں اسے نظمیں لکھ کر دیتا ہوں۔ وہ پڑھتا ہے۔ لوگ عش عش کرتے ہیں۔ اندرا اس سے محبّت کرتی ہے ..... یہ دھوکا ہے۔ فریب ہے۔ دغا بازی ہے۔

(۱۳)

اس کے بعد صحرائی کی حالت کچھ دیوانوں کی سی تھی۔ دوسرے دن صبح ہی اس نے اُٹھ کر ایک شعر لکھا۔ جو شاید شاعری کے لحاظ سے بہت غلط تھا۔ اس کا مطلب کچھ یُوں تھا:۔

"آندھی آ رہی ہے۔ طوفان آ رہا ہے۔ پُورب سے گھنگھور گھٹائیں اُٹھی ہیں۔ وہ مینہ برسے گا۔ کہ دُنیا کانپ جائے گی۔۔۔"

تھوڑی دیر کے بعد اُنہوں نے کچھ اور اشعار لکھے۔ اُنکا مطلب کچھ اسطرح تھا۔

"غور سے دیکھو۔ اس جوالا مُکھی پہ چھوٹے چھوٹے شعلے نکل رہے ہیں۔ بڑی دل

سے بند تھے۔ آج نکلے ہیں۔ بھیانک بھونچال آئیگا۔ آسمان سُرخ دھوئیں اور دُھول سے بھر جائیگا۔ بڑے بڑے پتھروں کی بارش ہوگی۔ خوبصورت محل کھنڈرات بن جائیں گے ....‘‘

دوپہر کے وقت انہوں نے لکھا۔

’’خاموش چھت کو دیکھو۔ وہ کڑیاں ہل رہی ہیں۔ یہ مکان گرے گا آثار دکھتے ہیں۔ کسی کی موت بلا رہی ہے ....‘‘

اسی طرح دن بھر پتہ نہیں۔ وہ کیا کیا اوٹ پٹانگ چیزیں لکھتے رہے۔ شام کے وقت وہ اپنے کمروں میں بیٹھے کچھ گنگنا رہے تھے۔ جس کا مطلب تھا:۔

’’آہ! اس خاموشی کو توڑ دو۔ میرا دل ڈوب رہا ہے‘‘۔

لیکن انکی دن کی بینائی کا مطلب رات کی تاریکی نے سمجھا۔

رات بیحد تاریک تھی۔ جیسے بیوہ کا مستقبل ہو۔

اور گھٹائیں اسطرح گھر آئی تھیں۔ جیسے بیوہ پر مصائب۔ ہاتھ بھر پرے کی چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔ اور صحرائی ہاتھ میں ایک خنجر پکڑے خاور کے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔ اسوقت اگر کوئی انہیں دیکھتا تو اُسے خواب میں بھی یہ خیال نہ آتا کہ یہی آدمی ’’رقاصہ‘‘ اور ’’آبشار‘‘ کا مصنّف ہے۔ اسوقت اُسکی آنکھیں اندھیرے میں اپنے خنجر سے زیادہ چمک رہی تھیں۔ اور پاگل شرابیوں کی طرح لڑکھڑاتے ہوئے وہ آگے بڑھ رہے تھے۔ انکے دل میں غصے کا ایک طوفان موجزن تھا۔ انہیں خود پتہ نہ تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔

ہُوا ہُو ہُو کر کے چل رہی تھی۔ کبھی کبھی کوئی کھڑکی کھٹ سے بند ہو جاتی تو صحرائی

سر سے لیکر پاؤں تک پسینہ میں نہا جاتے۔ قدم لرزنے لگتے۔ اور ہاتھ کانپنے لگتا۔ ایک بار وہ واپس بھی آئے۔ لیکن پھر آگے بڑھے اُنکے ہونٹوں نے دھیمی مضبوط آواز میں کہا۔ چور ——— ڈاکو ——— دھوکہ باز ———"

ایک بار زور سے بجلی کی کڑکڑاہٹ ہوئی۔ اور وہ جلدی سے زمین پر بیٹھ گئے جیسے کوئی حملہ کرنے لگا ہو۔ لیکن پھر اُٹھے اور آگے بڑھے۔

اور ابھی وہ خاور کے کمرے کے باہر پہنچے ہی تھے۔ کہ بجلی ایک بار پھر چمکی خاور کے کمرہ کے باہر ایک شیشہ لگا ہوا تھا۔ صحرائی نے دیکھا۔ کہ ایک انتہائی خونخوار انسان جو انتہا سے زیادہ بدصورت ہے۔ اور جسے دیکھنے کو جی نہیں چاہتا اس شیشہ میں کھڑا ہے۔ اُسکے ہاتھ میں خنجر ہے اور اُسکے بال بکھرے ہوئے ہیں۔

اُسے دیکھکر یکایک وہ خوفزدہ ہو گئے۔ اور آہستہ سے انہوں نے کہا۔ "یہ ——— یہ ہی کیا صحرائی ہے؟" تب اُنکے دل میں امینہ کی تصویر آئی۔ وہ بے ہوا جگہ میں پڑے ہوئے چراغ کی لو کی طرح خوبصورت تھی۔

اُس کو صحرائی کو آپس میں کیا نسبت ہے۔

بدصورت، خونخوار، غریب،

اس کے لئے دو حسین انسانوں کی زندگی بے مزہ کر دوں؟

اسکے لئے ایک آدمی کی شہرت، عزت، محبت، دولت سب کو تباہ کر دوں؟

واہ صحرائی صاحب!

تم لاہور میں کیوں آئے تھے۔ پہلگام کے جنگل کتنے سہاونے تھے۔ وہاں یہ کچھ بھی نہ تھا۔

تب پتہ نہیں اُنہیں کیا ہوا۔ انہوں نے خنجر پھینک دیا۔ مسکرائے! اور دھیرے دھیرے واپس چلے آئے۔

اپنے کمرہ میں آکر انہوں نے کاغذات کا ایک بلندہ نکالا۔ ایک صاف کاغذ لیکر اپنے اسی زنانہ دستخط سے اس پر لکھا۔

"خاور!

میں جارہا ہوں۔ یہاں رہنا ممکن نہیں رہا۔ لیکن تین سو کے قریب نظمیں غزلیں، مسدّس اور گیت چھوڑے جارہا ہوں۔ اُنہیں اپنے نام سے صحرائی کے نام سے شائع کرا دینا۔ اسکے بعد اگر تم کچھ بھی نہ لکھو گے۔ تو بھی کوئی تمہیں آنکھ اُٹھا کر دیکھ نہ سکیگا۔ یہ بلندہ میری تمام عمر کا اثاثہ ہے۔ یہ میں تمہیں سپرد کرتا ہوں فقط۔ (تمہارا اسکرٹڈمی)

اور اس خط کو اس بنڈل کے ساتھ ایک کپڑے میں باندھ کر اور اسکے اوپر جلی حروف میں "دنیا کے محبوب ترین صحرائی کی خدمت میں" لکھ کر اُس لے وہ بلندہ خاور کے دروازہ پر جاکر رکھ دیا۔ اور خود اپنا وہ بوسیدہ بستر اُٹھا کر ڈپٹی کمشنر صاحب کے بنگلہ سے باہر چلدیا۔ اسوقت اُسکی آنکھوں میں آنسو تھے لیکن اُنہیں کرتے سے پُونچھ کر وہ جلدی سے ایک طرف کو چلا گیا۔

اور اسکے بعد آجتک کبھی کسی نے اسکو نہیں دیکھا۔

پھر صحرائی

ڈپٹی کمشنر امیر حسن کو پھُولوں سے اسطرح پیار تھا جسطرح بچّوں کو کھلونوں سے ہوتا ہے۔ انکی اس محبّت میں شعریت نہ تھی۔ پدرانہ شفقت تھی۔

صبح ہی صبح اپنے باغ میں آجانا انکا ایک معمول بن گیا تھا۔ اس روز بھی وہ آئے۔ محمدو مالی نے دوڑ کر سلام کیا۔ ڈپٹی صاحب گلاب کے بے ترتیب پودے کو دیکھتے ہوئے بولے :-

تم نہایت سست آدمی ہو۔ محمدو! دیکھو۔ اسکی ڈالیاں کس بے ترتیبی سے بڑھ رہی ہیں۔ وہ دوسرا آدمی کہاں ہے۔ وہ چراغ ؟

محمدو نے وہیں کھڑے کھڑے کہا۔ سرکار! وہ چراغ کوئی آدمی تو نہیں ہے وہ تو سائیں ہے۔ اس سے کام نہیں ہو سکتا۔

ڈپٹی صاحب نے ہنسکر کہا شاعر آدمی نہیں ہوتے ؟

محمدو نے مسکرا کر کہا نہیں جی !

ڈپٹی صاحب نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ اچھا یہ ڈالیاں ٹھیک کرنا۔ اور چراغ سے کام لینا۔ اگر وہ کام نہ کرے تو کسی اور کو رکھ لینا۔

مگر چراغ پہلے ہی کام کر رہا تھا۔ محمدو بھی چپ چاپ لگ گیا۔ دونوں گلاب کی ڈالیوں کو درست کرنے لگے۔

صبح ایک حسین رقاصہ کی طرح مشرقی دروازے سے دنیا کے تھیٹر میں داخل ہو رہی تھی۔ اسکی رقصاں انگلیوں نے موتی جیسے تاروں کو خدا جانے کہاں گرا دیا تھا۔ باغ میں یوکلپٹس اونچے اونچے اشجار کی چوٹیاں اسکی نورانی انگلیوں کو چوم رہی تھیں۔ اور پھولوں کے ہونٹوں پر میٹھے ہوئے ننھے ننھے شبنمی قطرے منور ہو اٹھے تھے۔

اسی وقت ایک میٹھی کومل سی آواز سنائی دی۔ وہ ایک گیت کی آواز تھی۔

جو پھولوں کو بلاتی۔ شبنم کو گدگداتی۔ بادِ صبا کو ایک نغمہ بناتی۔ ان کے کانوں تک آ رہی تھی۔

چراغ نے اس گیت کو سُنا تو کام چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

گیت کا مطلب سیدھی سادھی اُردو میں کچھ اسطرح تھا۔

خاموش ہو گئے ہیں نغمے۔

ترنّم ماضی کی کہانی بن کر رہ گیا ہے۔

حُسنِ پر غرور نے سازِ عشق کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں۔

چراغ چُپ کھڑا تھا۔ پتہ نہیں کیوں۔ یکایک اُس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔

محمد و نے اُسے دیکھا تو حیران ہو کر کہا "کیوں؟"

چراغ نے جلدی سے آنکھیں پونچھ ڈالیں اور کہا "کچھ نہیں۔ یونہی۔ پتہ نہیں آنکھ میں کیا پڑ گیا تھا۔ یہ گیت کیا ڈپٹی صاحب کی بیٹی امینہ گا رہی ہے؟"

محمد و نے کہا۔ ہاں گا تو وہی رہی ہے۔ لیکن کتنا لچر سا گیت ہے۔ شہر میں کتنے ہی لفنگے۔ لچے۔ شہدے اور بھلے مانس بھی اس کو گاتے پھرتے ہیں۔ امینہ کے گھر والے ہیں نا۔ جانے کیا نام ہے انکا۔ کوئی انکو خاور صاحب کہہ کے بُلاتا ہے کوئی صحرائی صاحب کہہ کے بُلاتا ہے۔ پچھلے سال جب تم ابھی لاہور میں نہیں آئے تھے وہ صحرائی کا نام رکھ کر کشمیر میں چلے گئے۔ وہاں سے صحرائی کے نام سے نظمیں اور گیت لکھتے رہے۔ وہ اتنے مشہور ہو گئے۔ کہ اُنہیں یہاں آنا پڑا تب لوگوں کو پتہ لگا۔ کہ صحرائی تو دراصل خاور صاحب ہیں۔ بہت شور مچا۔ خوب جلسے ہوئے

ڈپٹی صاحب خاور صاحب کو گھر لے آئے۔ یہاں آنے کے کچھ دیر بعد چھوٹی سر کار سے خاور صاحب کی شادی ہو گئی۔ اُن ہی کا بنایا یہ گیت ہے، سمجھے؟ اسے کہتے ہیں کیفیت اور اسے کہتے ہیں عقل۔ تبھی تو ڈپٹی صاحب کہتے ہیں۔ محمد وساٹھ ہو گیا ہے۔

چراغ نے اس کی یہ لمبی تقریر نہیں سُنی۔ وہ پھر اسی گیت کو سننے لگا۔ اور پھر اسکی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

(۲)

لیکن محمد و چراغ کو کبھی بھی سمجھ نہ سکا۔ وہ عجیب قسم کا آدمی تھا جب سے نوکر ہوا تصویرِ غم بنا رہا۔ عقیل تھا۔ پرلے درجے کا ذہین تھا کمال تھا۔ لیکن معلوم نہیں اُسے کیا غم تھا۔ جو اندر ہی اندر اُسے کھنڈر کئے دیتا تھا۔

اور ایک اُس کا بھائی تھا۔ کچھ نیم پاگل سا۔ صورت میں چراغ سے زیادہ تاریک سیرت میں اُس سے دوچند دیوانہ۔ لیکن ہنستا تھا خوش۔ چراغ کو دیکھکر ہنستا تھا۔ اسکے غم کو دیکھ کر کہتا تھا۔ تم کو کس کا غم ہے؟

چراغ کہتا تھا۔ دُنیا کی ناشناسی کا۔ جو اشراف ہیں وہ دھکے کھا رہے ہیں جو رذیل ہیں۔ وہ عزت پا رہے ہیں۔ خاک اُنکے سر کو چاٹتی ہے۔ اور شہرت اُن کے پاؤں میں لوٹتی ہے۔ تم دیکھو۔ شہر کا بچہ بچہ صحرائی کی نظمیں گا رہا ہے۔ اسکی عزت اور عقل کے راگ الاپ رہا ہے۔ اور تم —— تم صحرائی یہاں کھڑے ہو۔ کسی کو پتہ بھی نہیں۔ وہ خاور کو صحرائی سمجھ رہے ہیں۔ ایک غبی کی عزت ہو رہی ہے۔ اور ایک شاعر مارا مارا پھر رہا ہے۔ صحرائی نے چراغ کے ہونٹوں پر انگلی رکھکر جلدی سے کہا خاموش کوئی سُن لے گا تو بُرا ہو گا ——

لیکن چراغ نے جوش سے کہا۔ خاموش! خاموش —— ہر وقت خاموش رہوں۔ آنکھوں کے سامنے ظلم ہوتا دیکھوں۔ اور خاموش رہوں۔ خدا کے لئے ایک بار جانے دو۔ اس خاور کی مٹی پلید کر کے نہ رکھ دوں۔ تو مجھے چراغ نہ کہنا۔ ہم غریب ہیں تو کیا ہوا۔ خدا نے زبان تو دی ہے۔

صحرائی نے آہستہ سے کہا۔ جوش میں مت آؤ میرے بھائی۔ آہستہ سے بات کرو۔ خاور کا کیا قصور ہے۔ خدا کی مرضی ہی ایسی ہے۔ قدرت نے یونہی لکھا ہے تو پھر تم یہاں آئے کس لئے تھے۔ کس لئے مجھے مالی بنا کر نوکر رکھا یا تھا۔ میں تمہاری کسی بھی بات کو سمجھ نہیں سکتا ہوں۔

صحرائی نے دھیرے سے کہا۔ چلو جانے دو۔ میں بے وقوف سہی۔ تم میرے بڑے بھائی ہو۔ میری مدد کرنا تمہارا فرض ہے۔ اور دل ہی دل میں صحرائی نے کہا۔ تم کیا سمجھو گے بھائی! کہ محبت کی خاطر انسان کیا کچھ کر سکتا ہے۔ تمہیں یہاں صرف اس لئے نوکر کرایا۔ کہ کبھی کبھی ایلینہ کی آواز سن سکوں۔ کبھی کبھی اسکا دیدار ہی ان بدنصیب کانوں کو نصیب ہو جائے۔

(۳)

خاور عرف صحرائی کی ملک بھر میں دھوم مچ رہی تھی۔ اسکے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔ اسکے اشعار سند۔ اسکی زبان ٹکسال اور اسکے خیالات لاثانی سمجھے جاتے تھے۔ خاور تھا اور عزت تھی۔ اور شہرت تھی۔ خاور تھا اور دولت تھی۔ خاور تھا اور محبت و رحمت تھی۔ کتنے ہی ہفتوں سے خاور نے ایک نیا شعر نہیں لکھا تھا۔ لیکن لوگوں کو یہ محسوس ہی نہ ہوتا تھا۔ کہ اسکے اشعار پرانے ہیں۔ وہ انہیں

پڑھتے تھے اور بار بار پڑھتے تھے اور ہر بار اسطرح جسطرح وہ ابھی ابھی اس پُر اسرار شاعر کی زبان سے نکلے ہوں۔ ہر بار اُن میں نئے معنی پنہاں ملتے تھے۔ ہر بار نئے خزینے دستیاب ہوتے تھے۔

اور امینہ مفتی کو اپنے محبوب کی اس شہرت سے پاگل ہوتی جاتی تھی۔ اُسے اب خاور سے زیادہ خاور کے اشعار سے محبّت تھی۔ اسطرح کے اشعار لکھنے والے سے کبھی نفرت بھی ہو سکتی ہے۔ اسکا خیال بھی اسکے لئے محال تھا۔ وہ اس سے محبت نہیں کرتی تھی۔ اسکی پرستش کرتی تھی۔

انجمن ترقی نسواں کا ایک جلسہ ہو رہا تھا۔ عورتوں کو مجلسی، سیاسی، مذہبی اور ادبی مسائل کے متعلق زیادہ سے زیادہ واقفیت بہم پہنچانا اور ان مسائل کے بحث طلب امور پر مناظر سے منعقد کرنا انجمن کا کام تھا۔ آج کے اجلاس کا تعلق ادب سے تھا۔ مضمون تھا۔ "صحرائی کی شاعری"۔ یُوں بھی امینہ ادبی سب کمیٹی کی صدر تھیں لیکن آج کے لئے خاص طور پر ان ہی کو کرسئ صدارت پیش کی گئی۔

کارروائی شروع ہوئی۔ پہلے صحرائی کی زندگی کے متعلق جو کسی کو معلوم تھا اُس نے بتایا اور جو کچھ بتایا گیا۔ اُسمیں سے ۹۰ فیصدی غلط تھا۔

پھر صحرائی کی شاعری پر تنقیدیں شروع ہُوئیں۔ تعریف و ثنا کے پل باندھ دیئے گئے۔ تعریفی الفاظ کا ایک دریا بہا دیا گیا۔ کسی نے شیکسپیئر سے اس کا مقابلہ کیا کسی نے ملٹن سے۔ کسی نے مولانا روم سے۔ کسی نے سعدی سے۔ کسی نے کالیداس سے اور کسی نے گیٹے سے۔

صحرائی کی تعریف ایک شراب تھی۔ جیسے پی پی کر ابینہ بیہوش ہو رہی تھی لیکن یکایک جیسے کوئی کسی کو نیند سے جگا دیتا ہے! ایسا چونک پڑی۔ ایک عورت کہہ رہی تھی :۔

"صحرائی کی عظمت کو میں تسلیم کرتی ہوں۔ اُس نے کچھ اچھی چیزیں لکھی ہیں ضرور۔ لیکن اتنے ہی سے ہم یہ نہیں کہہ سکتے۔ کہ وہ صاحب دیوان شعرا کی صف میں کھڑا ہو سکتا ہے۔ پچھلے دو ماہ سے صحرائی نے ایک بھی نئی چیز نہیں لکھی۔ اس سے پہلے بھی اسکی جو نظمیں، غزلیں اور گیت شائع ہوتے ہیں وہ ایسے معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے موجودہ زمانہ میں رہ کر نہیں۔ بلکہ کسی جنگل میں بیٹھ کر لکھے گئے ہوں۔ مجھے صدرِ محترمہ معاف فرمائیں۔ اگر میں کہوں کہ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ غزلیں، نظمیں اور گیت کشمیر میں ہی لکھے گئے تھے۔ اور وہاں سے آنے کے بعد خاور عرف صحرائی نے کوئی نئی چیز نہیں لکھی۔ میں نے نہایت غور سے صحرائی کی چیزوں کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ چیزیں اس قابل ہیں۔ کہ ہم ان کی پرستش کریں۔ لیکن ——

وہ ایک موٹی سی عورت تھی۔ اُسکی آواز تیز اور صاف۔

ابینہ غصّہ سے جل رہی تھی۔ مگر موٹی عورت نے کہا ——

لیکن انکی چیزوں کا مطالعہ کرنیکے بعد میں دو نتیجوں پر پہنچی ہوں۔ اوّل تو یہ کہ خاور عرف صحرائی نے یہ چیزیں ایک ہی بار ایک خاص جذبے کے ماتحت لکھی تھیں۔ اور اب یہ کوشش کرکے بھی وہ ویسی چیز تو کیا اسکے پایہ کے ہزاروں حصّہ کی چیز بھی لکھنے کے قابل نہیں ہے۔

ابدیہ نے میز کے نیچے رومال کو دونوں ہاتھوں سے اس طرح سے کھینچا۔ کہ وہ پھٹ گیا۔ لیکن وہ جلدی ہی سنبھل کر تقریر سننے لگی۔ وہ موٹی عورت کہہ رہی تھی ——

—— یا اگر یہ بات نادرست ہے تو —— تو مجھے معاف فرمائیں۔ تمام بہنیں اور خاص طور پر صدرہ محترمہ —— مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ خاور صحرائی نہیں ہیں صحرائی کوئی اور تھا۔ خاور نے اس کا سوانگ بھرا ہے۔ اُسکی چیزیں چُرا کر لوگوں کو دھوکا دیا ہے ——

ابدیہ کے ساتھ ہی ساتھ بیٹھی ہوئی جلسہ کی تمام مستورات یک وقت اُٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ کوئی بھی اس بات کو سُننے کے لئے تیار نہ تھی۔ سب طرف سے ایک شور سا اُٹھا۔ "اپنے الفاظ کو واپس لو۔ اپنے الفاظ کو واپس لو"۔ یہ اس انجمن کی ہتک ہے۔ اس موٹی عورت نے گھبرا کر کہا۔ "میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں"۔ سب عورتیں بیٹھ گئیں۔ موٹی عورت نے پھر جوش کے ساتھ کہا "لیکن میں اب بھی اس بات کو دوہراتی ہوں۔ کہ خاور عرف صحرائی نے یہ تمام چیزیں ایک جوش میں ایک ولولے میں اگر لکھی تھیں۔ اب وہ کوشش کر کے بھی ویسی چیزیں نہیں لکھ سکتے ——"

ابدیہ غصہ سے بھری بیٹھی تھی اُٹھکر کھڑی ہو گئی۔ صدارت کے قرینے کو بھول اور ادب کے قرینے کو بھول کر اُس نے کہا "آپ مجھے معاف کریں۔ آپ جو کچھ فرما رہی ہیں از سر تا پا غلط ہے۔ خاور اب بھی ویسی ہی چیزیں لکھ سکتے ہیں۔ جیسی انہوں نے پہلے لکھی تھیں۔ میں چیلنج کرتی ہوں۔ کوئی آئے اور دیکھ لے۔

اس موٹی عورت نے اس بار تحمل سے کہا "میں تیار ہوں۔ اگر میں غلطی پر ہوں تو اس غلطی کو تسلیم کرنے میں مجھ سے زیادہ کوئی خوش نہ ہوگا"۔

اہلیہ نے جوش کے ساتھ کہا۔ آج شام کو صحرائی اپنی ایک آج کی لکھی ہوئی چیز پیش کریں گے۔ اور میں وعدہ کرتی ہوں۔ کہ اسے سُننے کی خوش نصیبی سب سے پہلے انجمن ترقی نسواں کی ادبی سب کمیٹی کی اراکین کو ہو گی۔ اور میری یہ بہنیں اس محفل میں مدعو کی جائیں گی۔ اس کوئی عورتیں اور سب بے خبر رہیں۔ اور پھر جلسہ کل کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔

(۴)

خاور پر کئے گئے اس حملے کی خبر انجمن ترقی نسواں تک ہی محدود نہ رہی۔ لب بہ لب کان بہ کان یہ خبر شہر کے گوشے گوشے میں پہنچ گئی۔ اور وہ ٹھٹک کر رہ گئے۔

جس بات کا انہیں سدا سے خدشہ تھا۔ وہی سامنے آ گئی۔ سانس تیزی سے چلنے لگا۔ پیشانی کی نسیں پھول آئیں۔ اور دل دھک دھک کرنے لگا۔ خاور نے گھبرا کر ایک خاموش آواز میں کہا۔ "اب کیا ہو گا!" وہ بدبخت صحرائی پتہ نہیں کہاں چلا گیا ہے۔ اگر وہ لوگ نظم لکھنے کو کہیں گے۔ تو کیا کروں گا۔ پُرانی تمام چیزیں جو وہ چھوڑ گیا تھا ختم ہو گئی ہیں ——— تو ——— اب۔ اتنی عزت! اتنی شہرت کے بعد یہ حشر ——— خاور ماتھا پکڑ کر بیٹھ گئے۔

اس دفعہ انہوں نے سُنا۔ اہلیہ اور ڈپٹی صاحب باتیں کرتے ہوئے اندر آ رہے ہیں۔ اہلیہ کی آواز سے رنج و ملال اور گھبراہٹ سی عیاں تھی۔ ڈپٹی صاحب انہیں تحمل سے سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

بیٹی صبر سے کام لو۔ ادب کی خدمت کرنے والوں کی راہ میں نکتہ چین خار بن کر بچھ جاتے ہیں۔ لیکن اس سے گھبرانا نہیں چاہیئے۔

اور بیٹی کہہ رہی تھی۔ ابّا جی میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں بے عزتی برداشت نہیں کر سکتی۔ میں مرنا قبول کر سکتی ہوں۔ لیکن لوگوں کی آنکھ میں نیچی ہو کر نہیں رہ سکتی۔ تم تو نگی ہو رہی ابینہ! ـــــ ترپاہٹ پہلے سُنا تھا۔ آج دیکھ رہا ہوں۔ ابینہ نے کہا۔ لیکن ابّا جی! مجھے یقین ہے کہ خاور ہی صحرائی ہے۔ وہ اب بھی پہلے جیسی چیز لکھ سکیں گے۔ اور میں ان سب کا منہ توڑنے کے قابل ہو سکوں گی۔

اس پر وہ دونوں خاور کے پاس آ پہنچے۔ خاور اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اور انہیں دیکھ کر چہرے پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کرنے لگے۔

ڈپٹی صاحب خاور کی شکل دیکھتے ہی سب کچھ سمجھ گئے۔ اُنکے دل کو ایک دھکا لگا! اور تب وہ بہت جلدی سے باہر چلے گئے۔

اسکے بعد ابینہ بھی بہت دیر وہاں نہیں ٹھیری۔ لیکن جتنی دیر وہ وہاں رہی اتنی دیر میں اُس نے کچھ کانوں کان کہہ دیا۔ خاور خوف سے کانپنے لگے۔

(۵)

آفتاب مغرب کی خاموشیوں میں ڈوبا جا رہا تھا۔ شام مشرق کی چوکھٹ پہ آ کھڑی ہوئی تھی۔ اور ایک روشن تاریکی نے آسمان پر تسلط جمانے کی کوشش کی۔

محمد و مالی پھولوں کے تین گلدستے بنا کر لایا۔ ایک ڈپٹی صاحب کے کمرے میں رکھ دیا۔ اور ایک ابینہ کے کمرے میں ـــــ لیکن جب وہ خاور کے کمرے میں گیا تو دیکھا کہ کمرے میں چُپ چاپ بیٹھے ہیں سامنے ایک خالی کاغذ ہے۔ ہاتھ میں قلم ہے۔ آنکھوں میں آگ ہے۔

اُنکی صورت دیکھ کر وہ خوفزدہ سا ہو گیا۔ اور جلدی سے گلدستہ سجا کر وہ باہر چلا

آیا۔ لیکن بد قسمتی سے اس باہر والے کمرے میں ٹیلیفون پڑا تھا۔ جونہی محمد و اس کمرے میں آیا۔ تیونہی ٹیلیفون کی گھنٹی بڑے زور سے بج اُٹھی۔

محمد و نے چونکا اُٹھایا۔ اور کہا۔ جی حجور —— ہاں۔ ڈپٹی صاحب کے بنگلے سے سرکار اس وقت —— ہاں نہیں ہیں —— ہاں —— وہ ہیں —— کیا کہوں —— میں نہیں سمجھا —— انج —— من —— تر کھٹے —— ادب —— کے سیکر ٹری —— بہت اچھا —— آپ اور صاحب صدر —— یہاں تشریف لائیں گے —— ؟ بہت اچھا —— یہی کہہ دونگا —— کہہ دونگا۔ کسی اور جا یہ جائیں نہیں —— بندگی حجور ——

اور تب ایک بار پھر اُسے خاور کے کمرے میں جانا پڑا۔ دروازے میں ہی کھڑا ہو کر اُس نے کہا —— "حجور۔ انج من تر کٹے ادب کے سیکر ٹری اور صاحب صدر کہتے ہیں۔ وہ حجور کے پاس آج رات کے ۹ بجے تشریف لائیں گے۔ آپ کہیں جائیے نہیں۔

خاور خاموش رہے۔ چُپ چاپ اُس طرف تکتے رہے۔ محمد و پیغام دیکر جلدی سے باہر آگیا۔

(۶)

محمد و نے چراغ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ معلوم نہیں آج یہاں کیا ہے۔ جو اتنے آدمی دھکڑ دھکڑ چلے آ رہے ہیں۔ وہ دیکھو۔ سوانیاں بھی کتنی ہی ہیں۔ میں تم سے کہوں چراغ۔ چودھویں صدی کا چہرہ دیکھنا ہو تو اُدھر دیکھو۔ دو ایک کو چھوڑ کر کسی نے برقع نہیں اوڑھ رکھا۔

چراغ نے کہا۔ لیکن یہ ہے کیا؟ کیوں یہ لوگ یہاں اسوقت جمع ہوئے ہیں۔
لیکن چراغ کو بہت دیر تک اندھیرے میں نہیں رہنا پڑا۔ اصلی بات سُنتے ہی اُسکی آنکھوں سے مسّرت یوں عیاں ہونے لگی۔ کہ چھُپائے ہی نہ چھُپتی تھی۔ کہ اُسے ہفت اقلیم کی بادشاہت مل گئی ہے۔ اور اپنے کام کو وہ اتنی جلدی جلدی کر رہا تھا۔ کہ محمدو نے حیران ہو کر کہا۔ نہیں آج کیا ہو گیا ہے چراغ؟

(۷)

چراغ کو جو کچھ ہو گیا تھا۔ وہ اس نے محمدو کو نہیں بتایا۔ لیکن کام سے فراغت پاتے ہی۔ اور تب رات نے دُنیا پر تاریکی کی بارش کر دی۔ وہ اپنے چھوٹے سے جھونپڑے میں گیا اور بولا "صحرائی"!
صحرائی ڈِیوٹ کی روشنی میں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ لکھتے لکھتے اُس نے کہا "تمہیں سو بار کہا ہے بھیا۔ مجھے اس نام سے مت پکارا کرو"۔
لیکن چراغ نے جیسے اُسکی بات سُنی ہی نہ ہو۔ پاس جا کر بولا "کمال ہو گیا ہے۔ وہ خدا ہے غفور رحیم و کریم بھی اور جبار و قہار بھی۔ کمال ہو گیا ہے"!
صحرائی نے قلم کو علیحدہ رکھ کر کہا "تم اور اتنے خوش۔ بتاؤ کیا ہُوا ہے؟"
چراغ نے کہا "تم خوشی سے پھولے نہیں سماؤ گے۔ پاگل ہو جاؤ گے"!
صحرائی "تم کچھ کہو گے بھی بھائی! کہ پہیلیاں ہی ڈالتے جاؤ گے"!
چراغ نے ہنستے ہنستے کہا "تم نے شہر میں نہیں گئے؟ کچھ سُنا نہیں"!
صحرائی نے تنگ آ کر کہا۔ گیا تھا۔ سُنا ہے۔ صحرائی مر گیا۔
چراغ نے سنجیدگی کے ساتھ کہا "مرا نہیں۔ مرنے والا ہے۔ جسمانی طور پر نہیں

اخلاقی طور پر۔ لیکن ـــــ یہ صحرائی نہیں جو جھونپڑے میں رہتا ہے۔ وہ صحرائی جو ڈپٹی صاحب کے بنگلے میں رہتا ہے۔ جو ابینہ کا گھر والا ہے۔

صحرائی تڑپ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ بولا "تم کیا کہہ رہے ہو بھائی۔ صاف صاف کہو۔

چراغ نے اپنے گرانڈیل جسم کو چارپائی پہ گراتے ہوئے کہا "بس بھانڈا پھوٹ گیا۔ کچھ لوگوں کو شک ہوا۔ کہ خاور صحرائی نہیں ہے۔ اُنہوں نے مطالبہ کیا تھا کہ آج شام تک خاور میاں ایک نئی نظم لکھ کر سنائیں۔ اس سے پتہ لگ سکے گا۔ کہ خاور ہی صحرائی ہیں یا نہیں۔ اور رات ہونے کو آئی ہے۔ خاور ایک مصرعہ بھی نہیں لکھ سکا۔ ٹھٹ کا ٹھٹ لوگ انتظار کر رہے ہیں۔ اور خاور ایک لاش کی طرح خاموش ہے۔

صحرائی نے سُنا تو خیال میں ڈوب گیا اسطرح خاموش جیسے آدھی رات اور اسطرح غمناک جیسے یتیم خانہ کی رپورٹ۔

چراغ نے اُمید کی تھی۔ کہ اس خبر سے وہ خوش ہو گا۔ اب اُسے غمناک ہوتے دیکھا۔ تو حیران ہو کر پوچھا۔ کیوں کیا ہوا ؟

صحرائی نے دھیمی آواز میں دھیرے سے کہا۔ بہت بُرا ہوا ہے بھائی !"

چراغ نے جوش سے کہا "بُرا کیا ہوا ہے۔ جو سزاوار ہے اُسے سزا مل رہی ہے بُرا کیا ہے؟ خوشی کی بات ہے"۔

صحرائی نے دھیرے سے کہا "سزا و جزا کا مالک تو وہ پروردگار ہے۔ بندہ کا کیا ہے۔ اسے ہر ایک انسان کی مدد کرنی چاہیئے"۔

چراغ نے تڑپ کر کہا "چوری بھی؟"

صحرائی نے دھیرے سے کہا "ہاں —— اگر وہ اسے چوری سے باز نہ رکھ سکتا ہو تو —— لیکن بھیا باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے۔ میں ابھی کچھ نظمیں اور گیت تمہیں دیتا ہوں تم جاکر خاور کو دے آؤ۔ اسکی عزت بچ جائے گی۔

چراغ کے پاؤں تلے جیسے دھکتا انگار آ گیا ہو۔ اُس نے اُچھل کر کہا۔ تم کیا بک رہے ہو۔ میں نہیں کرونگا۔ صحرائی نے نرمی سے کہا۔ تم میرے بھائی نہیں ہو؟ تم میری بات نہیں مان سکتے؟

چراغ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے! اس نے دھیرے سے کہا "میں نے کبھی تمہیں انکار کیا ہے۔ تم عقلمند ہو۔ شاعر ہو۔ میں بیوقوف کسان ہوں۔ تمہارے دل میں جو خیالات اور جذبات ہیں۔ وہ مجھ میں نہیں ہیں۔ میں کبھی بھی سمجھ نہیں سکا ہوں۔ نہ تم کو نہ تمہاری شاعری کو —— تم انسان نہیں ہو ——"

نہیں۔ بھیا! صحرائی نے جلدی سے کہا۔ میں انسان ہی ہوں۔ امینہ سے محبت ہے۔ اسے میں تکلیف میں دیکھنا نہیں چاہتا ہوں"۔ اگر خاور کا بھید پھوٹ گیا۔ تو امینہ کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔ اس خود غرضی کے لئے میں خاور کی مدد کرنا چاہتا ہوں

چراغ نے بیٹھے ہوئے اُبال کی سی آواز میں کہا۔ جو تمہاری مرضی ہے۔ صحرائی!!

نکئے کے ایک میلے سے پُرانے غلاف میں کاغذوں کے بہت سے ٹکڑے گو ڑے کرکٹ کی طرح بھرے ہُوئے تھے۔ صحرائی نے غلاف میں سے مٹھی بھر کر کچھ ٹکڑے نکالے۔ اور ان میں سے فوراً ایک ایک کر کے دیکھنے لگا۔ اُن میں سے ایک گیت کو

دیکھ کر وہ یکا یک رُک گیا۔ اور پھر بولا۔ دیکھو بھائی! کتنا اچھا گیت مل گیا ہے وقت کے لئے کتنا موزوں ہے۔

چراغ نے لے کر پڑھا۔ اس کا مطلب کچھ اس طرح تھا۔

"میرے مولا! وہ ایک اور گیت سُنانے کو کہہ رہے ہیں۔

تم جانتے ہو —— کہ میں ایک بھی گیت نہیں گا سکتا۔ تم ہی جب چاہتے ہو اس ساز سے نغمے پیدا کرتے ہو۔ تم جب چاہتے ہو۔ قیامت اُٹھاتے ہو۔ اور بٹھا دیتے ہو۔ لیکن —— ہیں؟

تمہاری بھی یہی خواہش ہے۔ میرے مالک! تو ...... ——

دھیرے دھیرے آبشاروں کا گیت اُٹھاؤ۔

ترنگوں کے ترنم کو لیکر وہ آسمان کے ستاروں تک پہنچے۔

جاگ اُٹھیں سوئے ہوئے پھول۔

اور شبنم رقص کرنے لگے۔

بھول جائیں خوشیاں۔

اور غم کے دریا بہنے لگیں۔

میرے مولا —— ! میرے مالک —— !"

چراغ نے پڑھ کر کہا۔ گیت اچھا ہے۔ موزوں بھی معلوم ہوتا ہے۔ چلو اب چلیں۔

صحرائی نے کہا۔ ایک منٹ ٹھیرو۔ کچھ اور اچھی اچھی چیزیں بھی ساتھ بھیجدوں تو اچھا ہو گا —— اور پھر اسی غلاف میں سے اور کوڑا کرکٹ نکال نکال کر دیکھنے لگا۔

اس وقت چراغ نے جھونپڑی سے باہر جھانک کر کہا اب تمہارا تردد فضول معلوم پڑتا ہے۔

صحرائی " کیوں؟

چراغ " میرے خیال میں ۹ سے اوپر کا وقت ہو گیا ہے۔ اور جو ہونا تھا۔ ہو چکا ہو گا۔

صحرائی نے جلدی بہت کاغذ جیبوں میں ٹھونستے ہوئے کہا ——— تب تو جلدی چلو ——— اور تب وہ دونوں وہاں سے باہر نکل پڑے۔

(۹)

رات خاموش تھی اور تاریک۔ جس باغ میں سے ہو کر وہ دونو جا رہے تھے۔ اسمیں چپ چاپ برس رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کبھی بھی یہاں کوئی نہیں آیا۔

چراغ نے حیران ہو کر کہا۔ معلوم ہوتا ہے۔ وہ سب لوگ چلے گئے۔

صحرائی نے سر پر جیسے کسی نے تلوار مار دی ہو۔ جھنّا اٹھا۔ اور گھبرائی آواز میں کہا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ ———"

چراغ نے سنجیدگی سے کہا۔ میرا مطلب ہے کہ ہم دیر سے پہنچے ہیں۔ بھانڈا پھوٹ چکا۔ اب ہمارے بنائے سے بنے گا نہیں۔

صحرائی نے جلدی سے کہا " تو وہ لوگ یہاں تھے؟

چراغ " یہاں بھی تھے "

صحرائی " تو شاید اندر ہوں۔ شاید اس نے کوئی چیز لکھ لی ہو۔ اور سنا رہا ہو "

چراغ نے ہنسکر کہا " تم تو ہو پاگل۔ خاور اور کچھ لکھے گا۔ خدا خدا کرو۔ اور وہ آدمی

اگر یہاں ہیں تو ابھی معلوم ہوا جاتا ہے۔ میرے پیچھے آجاؤ۔"

پھر اندھیرے میں دو خاموش سائے چلنے لگے۔

رات خوب تاریک تھی۔ اور آسمان میں تارے نکل آئے تھے۔ بڑے پوسٹ آفس کی گھڑی نے تھوڑی ہی دیر ہوئی ٹن ٹن کرکے ۹ بجا دیئے تھے۔ اور وہ دونوں مکان کے چاروں طرف گھوم رہے تھے۔ آخر تھک کر چراغ نے کہا۔ یہاں کوئی نظر نہیں آتا۔

اسی وقت انہیں ایک آواز سنائی دی۔

یا رحیم! یا کریم! اے ذاتِ پاک! اے پاک پروردگار تو سب کی شرن ہے، تو سب کا آسرا ہے ——

چراغ نے پہچانا۔ وہ ڈپٹی صاحب تھے۔ عصر کی نماز ادا کرنے کے بعد سجدے میں پڑے دعا مانگ رہے تھے۔ اے رب العالمین! اے رحمٰن! اے رحیم! اے یوم قیامت کے مالک! اے بخشش کرنے والے! اے کرم کرنے والے! اے شفقت کرنے والے! میری بیٹی کو بچاؤ۔ تم گواہ ہو۔ میں نے ہمیشہ اسے جان سے عزیز رکھا ہے۔ لیکن آج اسکی آنکھوں میں خون ہے۔ میں نے دیکھا ہے۔ اے مالک دین و دنیا! اسکے دل پر اس باغی فرشتے نے قبضہ کر لیا ہے۔ وہ اپنے خاوند سے نفرت کرنے لگی ہے مجھے ڈر ہے غصے میں وہ کچھ کر نہ بیٹھے۔ اسلئے اے رحیم! اے غفور! اسے صراطِ مستقیم پر لے آ۔ اسے نیک بیوی کے سے چلن سکھا۔ اسکے دل کو امن اور چین دے۔ وہ میری اکلوتی بیٹی ہے یا رب! وہ بے ماں کی بیٹی ہے۔ وہ یتیم ہے۔

صحرائی اور چراغ۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ تب صحرائی نے جلدی سے چراغ کا ہاتھ پکڑ کر کہا "چلو بھیا۔ یہاں سے چلو۔" لیکن ابھی وہ تھوڑی

دور ہی گئے تھے۔ صحرائی چلتے چلتے کھڑا ہو گیا۔ اور بولا۔ وہ دیکھو۔ وہ سامنے اس اُوپر والی منزل میں کھڑکی میں کون ہے۔ چراغ نے غور سے دیکھا اور کہا۔ ارے یہ تو خاور اور ابلینہ ہیں۔ لیکن اُنہیں کیا ہُوا ہے۔ خاور رو بکا سا کھڑا ہے۔ ابلینہ ایسے معلوم ہوتی ہے۔ جیسے ابھی جھپٹے گی اور خاور کو کھا جائے گی۔ صحرائی نے کہا۔ چلو ذرا نزدیک چلیں۔ جہاں سے اُنکی آواز سُن سکیں۔

تب وہ دونوں کھڑکی کے نیچے دیوار سے پرے ہٹ کر کھڑے ہو گئے اُنہوں نے سُنا۔ ابلینہ کہہ رہی ہے۔

"تو جو کچھ تم نے کہا ہے۔ وہ ٹھیک ہے"

دھیمی آواز میں خاور نے کہا "ہاں"

ابلینہ نے کڑک کر کہا "تو تم صحرائی نہیں ہو"

"نہیں"

"تو تم نے مجھے دھوکا دیا تھا"

"ہاں"

ابلینہ کو جیسے سانس چڑھ گیا ہو۔ وہ بولی نہیں۔ لیکن اُسکے سانس لینے کی آواز نیچے تک آتی رہی۔ تب دھیرے سے خاور آگے بڑھا۔ صحرائی اور چراغ نے دیکھا کہ وہ ابلینہ کے بہت نزدیک پہنچ گیا ہے ——— ابلینہ نے حقارت سے اُسکی طرف دیکھا۔ اور پیچھے ہٹ گئی۔ اسکے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا اور وہ ہاتھ اسطرح کانپ رہا تھا۔ جیسے اُس کے پیچھے کوئی مشین لگی ہو۔ خاور گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ لئے اور کہا :-

"امینہ"

امینہ بولی نہیں۔ چھت کو تکتی رہی۔ اُس نے خاور کی طرف دیکھا بھی نہیں
اُبھرے ہوئے گلے سے خاور نے پھر کہا۔

"امینہ میں معافی مانگتا ہوں۔"

امینہ تب بھی چھت کی طرف دیکھتی رہی۔

خاور نے پھر کہا۔

"امینہ۔ میں معافی مانگتا ہوں۔ اور اگر تم معاف نہیں کرو گی۔ تو میں مرجاؤنگا۔"

امینہ نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ذلالت کی زندگی سے موت بہتر ہے۔"

خاور نے کہا۔ "تو تمہاری یہی مرضی ہے۔ کہ میں مرجاؤں۔"

امینہ چھت کی طرف دیکھتی رہی۔

اسی وقت خاور نے جیب سے ایک چمکتا ہُوا خنجر نکال لیا۔

صحرائی نے چونک کر کہا "یہ کیا؟"

چراغ نے اُس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھدیا۔

خاور نے خنجر کو سینہ پر تان کر کہا "امینہ میں مرتا ہوں۔"

امینہ تب بھی چھت کی طرف تاکتی رہی۔

خاور نے کہا "امینہ! خدارا ایک بار ادھر دیکھو۔ تو کیا میں مرجاؤں؟"

امینہ پھر بھی خاموش۔

خاور نے کہا "امینا تم مجھے قتل کررہی ہو۔

امینہ نے چھت سے نگاہ نہیں ہٹائی۔

خاور نے پھر کہا "امینہ! تم مجھے قتل کر رہی ہو۔

امینہ نے پھر بھی نہیں دیکھا۔

تب بجلی کی سی تیزی کے ساتھ خاور نے وہ لمبا خنجر اپنے سینے میں گھونپ لیا۔ ایک دردناک چیخ سے سب اطراف گونج اٹھی۔ اور امینہ نے گھبرا کر نیچے دیکھا کہ خاور بیچ مُچ مرا پڑا ہے ——

گھبراہٹ میں جلدی سے خاور کے اُوپر جُھکی۔ اور اس نے وہ خنجر نکال کر کھڑکی میں سے نیچے باغ میں پھینکدیا۔ جہاں چراغ اور صحرائی کھڑے تھے۔

اس وقت اس کمرے کے پچھلے دروازے سے دو آدمی اندر آئے۔ وہ انجمن ترقی ادب کے سیکرٹری اور صدر تھے۔ جن کے آنے کی اطلاع چراغ نے شام کے وقت خاور کو دی تھی۔ اُنہوں نے آتے ہی دیکھا کہ خاور خون میں لت پت پڑا ہے۔ امینہ ایک خون آلود خنجر کھڑکی سے نیچے پھینک رہی ہے اور خاور آخری سانس لیتا ہوا کراہ رہا ہے۔ خوف دہراس نے انہیں کچھ بولنے نہیں دیا۔ وہ چُپ چاپ کھڑے رہے۔ خاور نے ایک بار کراہ کر کہا۔

"قاتل۔ قاتل امینہ —— قاتل ——

نیچے باغ میں صحرائی نے چُپکے سے وہ خنجر اُٹھا لیا۔ اور پاگلوں کی طرح چراغ کو دیکھتے ہوئے پوچھا "یہ —— یہ کیا ہُوا"؟

چراغ زبردستی دھکیل کر اُسے گھر کی طرف لے آیا۔ لیکن اُس نے دیکھا نہیں کہ وہ خون آلود خنجر بھی ساتھ ہی لئے آرہا ہے۔

(۱۰)

مؤذن ایک نہایت دردناک لہجے میں علی الصباح کی اذان دے رہا تھا۔ اور ایک فقیر صبح صبح اُٹھ کر کہہ رہا تھا۔

یا اللہ الا اللہ

یا اللہ الا اللہ

دُور مشرق کی گود میں بچے کی مسکراہٹ کی طرح پو پھٹ رہی تھی ——

چراغ جلدی سے اپنے جھونپڑے میں آیا۔ صحرائی دیا جلا کر کچھ لکھ رہا تھا۔

چراغ رات بھر ڈپٹی صاحب کے مکان پر رہا تھا۔ ابھی ابھی واپس آ رہا تھا۔ وہ صحرائی کو لکھتا ہُوا چھوڑ گیا تھا۔ اس کا خیال تھا۔ آئیگا تو وہ سو یا پڑا ہو گا۔ اب اُسے جاگتا دیکھا تو ذرا طیش سے کہا۔

"کیا لکھ رہے ہو؟"

صحرائی نے کاغذ کو ایک طرف چھپاتے ہُوئے کہا۔

"کچھ نہیں"۔

چراغ نے غصّہ کیساتھ کہا "کچھ نہیں سے کام نہیں چلے گا۔ دکھاؤ کیا لکھا ہے"۔

تب اُس نے وہ کاغذ لیکر پڑھا۔ وہ ایک نظم تھی۔ بہت ہی جگہوں پر تو اُسے کچھ بھی مطلب سمجھ نہیں آیا۔ جو کچھ اُسے سمجھ آیا۔ جو کچھ بعد ازاں اُس نے لوگوں کو سُنایا۔

اُس کا مطلب کچھ اسطرح تھا:۔

قبر کے صحرا میں کاروانِ عالم نہ جانے کہاں گم ہو گیا ہے۔

موت کی رات نے تاریکی کا پردہ ڈال رکھا ہے۔

(۱۱)

شہر میں خوف دہراس کی طغیانی سی آگئی تھی۔ لوگ سہم سہم کر باتیں کر رہے تھے کسی کو بھی اس بات کی اُمید نہ تھی۔ لیکن کسی کو بھی خاور کے مرنے کا افسوس نہ تھا۔ امینہ سے خواہ مخواہ ہر ایک کو عقیدت سی ہو گئی تھی۔ اس کی مجلسی مقبولیت پہلے بھی بہت تھی۔ اب انہیں وہ ایک شہید معلوم ہونے لگی۔ لیکن اسکا کسی کو بھی شک نہیں تھا کہ امینہ نے خاور کو قتل نہیں کیا۔

جنگل کی آگ کی طرح یہ خبر شہر میں گھوم رہی تھی۔

اور ٹھٹ کے ٹھٹ لوگ کچہری کی طرف چلے جا رہے تھے۔ عدالت کا وقت ابھی نہیں ہوا تھا۔ ڈپٹی صاحب ابھی تشریف نہیں لائے تھے۔ لیکن کچہری میں بڑ ٹھسا ٹھس بھرے ہوئے تھے۔ باہر بھی انسانوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ معاً ٹن ٹن کر کے دس بج گئے۔

اسی وقت سپاہیوں کے پہرے میں امینہ کو لایا گیا۔ ایک ہی رات میں اُسکا رنگ زرد ہو گیا تھا۔ اور وہ اسطرح چل رہی۔ جیسے قبر سے نکل کر آئی ہو۔ ایک بار بھی اُس نے آنکھ اُٹھا کر اُوپر نہیں دیکھا۔ لیکن جدھر جدھر سے وہ گزرتی گئی۔ لوگ خود بخود راستہ بناتے گئے۔ کوئی بھی کچھ نہیں بولا۔

ایک خاموش سائے کی طرح وہ دروازے میں داخل ہو گئی۔ اور چپ چاپ ملزموں کے بنچ پر جا کر بیٹھ گئی۔

لوگ ٹکٹکی کبھی ڈپٹی صاحب کی طرف دیکھتے تھے۔ اور کبھی امینہ کی طرف۔ لیکن وہ دونوں پاؤں میں نظریں گرا کر دو مصمم ارادوں کی طرح خاموش بیٹھے تھے۔

میں ساغر و مینا لئے کھڑا ہوں۔

ساقی ——— ساقی کی آوازیں سنتا ہوں۔

لیکن یہ پتہ نہیں لگتا کہ کسے پلاؤں۔

کیا کروں

کہاں جاؤں۔

لیکن ابھی وہ اس نظم کو پڑھ ہی رہا تھا ——— کہ صحرائی یکایک چونک پڑا۔

بولا وہاں کا کیا بنا؟

چراغ نے دھیمے سے کہا۔ جو بنتا تھا ——— امینہ گرفتار کر لی گئی ہے۔ اس نے کسی طرح کا بیان دینے سے انکار کر دیا ہے۔ اسکے پاس سے خاور کا ایک خط ملا ہے جسمیں اس نے لکھا تھا۔ کہ میں صحرائی نہیں ہوں۔ انجمن ترقی ادب کے سکریٹری اور صدر اس بات کے گواہ ہیں۔ کہ امینہ نے اُن کے سامنے ایک خنجر خاور کے سینے سے نکالکر کھڑکی میں پھینکا۔ اور کہ خاور نے مرتے وقت امینا! تم مجھے قتل کر رہی ہو۔ اور قاتل۔ امینا قاتل کہا۔ ان تمام شہادتوں کی موجودگی میں ڈپٹی صاحب بھی اُسے ضمانت پر رہا کرانے کی کوشش نہیں کی! اب کیا ہو سکتا ہے۔ اُسے پھانسی ہو گی یا کم سے کم کالا پانی ہو گا۔ اور ہو گا اپنے باپ کے ہاتھ سے۔ کیونکہ ڈپٹی صاحب خود یقین کرتے ہیں کہ اُس نے قتل کیا ہے۔ اور انہیں کی عدالت میں آج اُسے پیش ہونا ہے

اور میں کہتا ہوں ———

اسیطرح وہ کہے جا رہا تھا۔ اور نہ جانے کب تک کہتا رہتا اگر صحرائی یکایک بیہوش ہو کر نہ گر پڑتا۔

قبر کی خاموشی انکی زبان پر تھی۔ اور موت کی زردی اُنکے چہروں پر۔

(۱۲)

صبح کے بیہوش ہوئے صحرائی کو کہیں دس بجے جا کر ہوش آیا۔ اُس نے ایک لمبا سانس لیا۔ اور دھیرے سے کہا "بھائی"!

چراغ بچوں کی طرح سسکیاں بھر رہا تھا۔ اب یہ آواز سُنی۔ تو اُس نے جلدی سے آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ گود میں پڑے صحرائی کو اسطرح سینے کے ساتھ چپکا لیا۔ اور پیار سے اُسکی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اُس نے کہا "صحرائی۔ عزیز"!

صحرائی رو رہا تھا۔ آنسو گالوں سے ڈھلک ڈھلک کر کپڑوں پر گر رہے تھے۔ اُس نے دھیرے سے کہا "تو وہ اُسے لے گئے بھائی"!

چراغ خاموش رہا۔ خوف نے اسکے دل کو یوں پکڑ لیا تھا۔ جیسے کوئی شاخ پر بیٹھے کسی پرندے کو ہاتھ میں پکڑ لیتا تھا۔

صحرائی نے کہا "بولو۔ بھیا۔ کیا وہ اُسے لے گئے؟

چراغ چُپ رہا۔

صحرائی اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ دروازے میں سے آتی ہوئی دھوپ کو دیکھکر اُس نے چونک کر کہا ــــ "ہیں اِتنا دِن چڑھ آیا ہے۔ اب تو کوئی دس گیارہ بجے ہونگے بھائی! اب تو اس کا مقدمہ شروع ہو گیا ہوگا۔

چراغ پھر بھی بیٹھا رہا۔ اسکی آنکھ سے حسرت ایسے برس رہی ہے۔ جیسے وہ مرد نہیں۔ ایک بیوہ عورت ہو۔ جسکا اکلوتا بچہ اُسکے سامنے مر رہا ہو۔

صحرائی نے اپنے کُرتے کے نیچے رات والے خنجر کو ٹٹولا اور پھر اُٹھکر کہا "بھائی

تب چراغ بھی تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے چٹان کی سی مضبوط آواز میں کہا۔ "نہیں تم نہیں جاؤ گے"۔

صحرائی کی آنکھوں سے دیوانگی برس رہی تھی۔ اس نے جیسے چراغ کی آواز سُنی ہی نہ ہو۔ دھیرے سے بولا۔ "اب جاتا ہوں۔ شاید آ نہیں سکونگا اسلئے سلام میرے بھائی!

اور تب وہ جواب کا انتظار کئے بنا ہی جھونپڑے سے باہر نکل گیا۔ چراغ دوڑ کر دروازے پر آیا۔ رو کر بولا۔ "صحرائی۔ صحرائی"! لیکن صحرائی جا چکا تھا۔ آسمان بادلوں سے پٹا پڑا تھا۔ اور کہیں کہیں سے دھوپ تیر کی طرح نیچے زمین کی طرف آ رہی تھی۔

(۱۳)

عدالت میں اتنی خاموشی تھی۔ کہ اگر سوئی بھی گرتی۔ تو آواز آتی۔ ہر ایک آدمی چپ چاپ تھا۔ ضروری شہادتیں ختم ہو چکی تھیں۔ ڈپٹی صاحب ملزمہ کے بیان قلمبند کرنے کو تیار ہو رہے تھے۔ کہ اُسی وقت یکایک املینہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ اسطرح زرد تھی۔ جیسے سرسوں کا پھول ہوتا ہے۔ اور اس کی آنکھیں اسطرح بے حس تھیں۔ جیسے وہ کسی مُردہ کی آنکھیں ہوں۔

ڈپٹی صاحب نے اسکی طرف دیکھا نہیں۔ وہ اسیطرح اپنے پاؤں کی طرف دیکھتے رہے ——

املینہ نے دھیمی مری ہوئی سی لیکن مضبوط آواز میں ٹھہر ٹھہر کر کہا "میرے بیان کی ضرورت نہیں۔ میں جرم کا اقبال کرتی ہوں۔ میں جینا نہیں چاہتی!!"

عدالت میں ہر ایک آدمی سنّاٹا تھامے کھڑا تھا۔

لیکن یہ الفاظ سُنتے ہی ہر ایک دل میں ہُوک سی گونج گئی۔ جیسے بادلوں میں

بجلی کوند جاتی ہے۔

ڈپٹی صاحب اُٹھ کر ساتھ والے کمرے میں چلے گئے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد واپس آ گئے۔ لوگ سمجھ گئے کہ اُس طرف کیوں گئے تھے۔ وہ بھری عدالت میں آنسو گرانا نہیں چاہتے تھے۔

لیکن بہت روکنے پر بھی ایک لمبے سانس کو وہ نہیں روک سکے۔ تب انہوں نے جلدی سے کہا۔ فردِ جرم کے متعلق میرا خیال ہے کہ ——"

لیکن اسی وقت ایک وحشی سا ناٹے قد کا بدصورت آدمی عدالت میں داخل ہوا آتے ہوئے اُس نے کہا۔

خدارا انصاف کے نام پر —— ایک لمحہ کے لئے ——

ہر ایک آدمی چونک پڑا۔ انہوں نے دیکھا۔ کہ آنے والا بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھا آ رہا ہے۔ اور اب ڈپٹی صاحب سے تھوڑی ہی دوری پر کھڑا ہے۔

اُس نے کہا۔ میں اس مقدمے کے متعلق ایک نہایت ضروری بات کہنا چاہتا ہوں۔ اُسے نہ سُننا انصاف کا خون کرنا ہوگا ——"

امینہ بیہوش سی نگاہوں سے اُسکی طرف دیکھ رہی تھی۔ سب طرف خاموشی تھی۔ سرکاری وکیل نے آہستہ سے کہا" اس مقدمے سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

اُس وحشی سے آدمی نے جوش کے ساتھ کہا" ہے تو"

سرکاری وکیل نے ڈپٹی صاحب کی طرف دیکھا! ور آہستہ سے کہا آپ اجازت دیں تو اُس کا بیان لے لوں"

ڈپٹی صاحب نے سر ہلا کر اپنی مرضی ظاہر کی۔

سرکاری وکیل نے اُس آدمی کو کہا۔" وہاں کھڑے ہو جاؤ۔" اور پھر کہا۔ کہو۔ جو کہونگا ایمان سے سچ کہونگا۔

اُس آدمی نے جوش کے ساتھ کہا۔" جو کہونگا۔ ایمان سے سچ کہونگا۔"

تمہارا نام

صحرائی!

وکیل نے تڑپ کر کہا۔" کون؟"

صحرائی نے اشتعال کے ساتھ کہا۔" صحرائی۔ میں نے ہی شروع شروع میں کشمیر سے اپنی نظمیں لاہور کے اخباروں کو بھیجی تھیں۔ لیکن جب لاہور پہنچا۔ تو دیکھا۔ کہ مسٹر خاور پہلے ہی سے لاہور میں پہنچکر اپنے آپ کو صحرائی مشہور کر چکے ہیں۔ میں ہی صحرائی ہوں۔ اسکا ثبوت میری جیبوں میں بھری ہوئی یہ نظمیں ہیں۔ جو ابھی تک کہیں بھی شائع نہیں ہوئیں ——

" پھر"! سرکاری وکیل نے پوچھا۔ پھر کیا ہوا؟

صحرائی نے آہستہ سے کہا۔" میں غصہ میں پاگل ہو اُٹھا۔ میں نے اپنے بھائی چراغ کو ڈپٹی صاحب کے ہاں مالی رکھا دیا۔ اور خود بدلے کی تاک میں رہا آخر —— اسی رات کو —— اس چاقو کے ساتھ —— اور یہ کہتے کہتے اس نے اپنے کرتے کے نیچے سے رات والا خنجر نکال لیا۔ جس پر اب بھی خون جما تھا۔ —— میں نے اپنا بدلہ لے لیا ——"

عدالت میں ہُو کا سناٹا تھا۔ کتنے ہی لوگوں کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں لیکن خاموشی تھی۔ اور ایسی کہ ہوا بھی کھڑی ہو گئی تھی۔

امینہ نے ایک بار سر اُٹھا کر صحرائی کی طرف دیکھا آنکھوں میں پتہ نہیں اُس نے کیا کہا۔ اور کیا سُنا۔ اُسکی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے —— لیکن صحرائی چپ چاپ —— خاموش ——

کچھ دیر بعد گرج کر اُس نے کہا —— "میں قاتل ہوں۔ مجھے پھانسی دو۔ میں قاتل ہوں ——"

ڈپٹی صاحب نے بھی اُسکی طرف دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اُس کے دل سے ایک بھاری بوجھ اُتر گیا ہے۔

لیکن اُسی وقت عدالت کے باہر بے حد شور سُنائی دیا۔

ڈپٹی صاحب نے پوچھا "یہ شور کیسا ہے؟"

دربان نے کہا "ایک آدمی اندر آنا چاہتا ہے۔ حضور! لوگ اُسے روک رہے ہیں"۔

ڈپٹی صاحب نے دھیرے سے کہا "اُسے لے آؤ"۔

اور صحرائی . . . . . چراغ پاگلوں کی طرح بال بکھیر کر عدالت میں داخل ہو رہا ہے۔ آتے ہی اُس نے کہا۔

"یہ سب جھوٹ ہے حضور یہ سب جھوٹ ہے"۔

ڈپٹی صاحب نے اپنے مالی کو پہچانا۔ اور کہا "کیا بات ہے؟"

چراغ نے ہاتھ جوڑ کر کانپتے ہوئے کہا۔ حضور میاں خاور کو نہ صحرائی نے مارا ہے۔ نہ چھوٹی سرکار نے۔ میاں خاور نے خودکشی کی ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے چھوٹی سرکار اُدھر دیکھ بھی نہیں رہی تھیں۔ اُنہیں پتہ بھی نہیں لگا۔ کہ میاں خاور

خودکشی کر رہے ہیں۔
ڈپٹی صاحب نے آہستہ سے کہا۔ تو پھر صحرائی نے یہاں آکر اقبال کیوں کیا؟
چراغ نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ حضور۔ وہ چھوٹی سرکار کو بچانا چاہتا ہے۔ میں کلام پاک کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ میرا بھائی بے قصور ہے۔
اُسی وقت ابینہ کو نہ معلوم کیا ہوا۔ وہ بنچ سے نیچے گر پڑی۔ اُس کا رنگ انتہا سے زیادہ زرد تھا۔ اور جسم ایک لاش کی طرح بے حس۔
وزیٹروں میں ایک ڈاکٹر تھا۔ اُس نے دوڑ کر اُسے دیکھا اور کہا۔ "یہ کیا ہوا۔ جیب سے Steethoscope نکالکر اُس نے پھر دیکھا۔ خوف کی ایک لہر سی اُسکے چہرے پر دوڑ گئی۔ اور اُس نے پژمردہ سی آواز میں کہا "ختم —— دل کی حرکت بند ہو جانے سے ——"
صحرائی نے سُنا تو صُم بکمٌ کھڑا رہا۔ لیکن چراغ نے دیکھا۔ کہ کھڑا رہنے کے لئے اُسے کتنی کوشش کرنی پڑ رہی ہے۔ جنگلے کو اُس نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ رکھا ہے۔
ڈپٹی صاحب اُٹھ کر اپنے کمرے کے اندر چلے گئے۔ ابینہ کو بھی اُٹھوا کر اُسی کمرے میں بھیج دیا گیا۔
لیکن ایک عجیب بات تھی۔ لوگوں کو ابینہ کے مرنے کا افسوس تو تھا۔ مگر اب بھی صحرائی میں اُنکی دلچسپی کم نہ ہوئی تھی۔ ایک آدمی کی نظموں نے ایک پُر اسرار طریقہ پر اُنہیں اتنی دیر تک پاگل بنائے رکھا تھا۔
صحرائی کا نام بچے بچے کی زبان پر تھا۔ اور اُسکے گیت ہر گلی کوچے میں گونج

رہے تھے۔ اور آج وہ صحرائی ——— وہی صحرائی اُنکے سامنے کھڑا تھا۔ پہلی بار انہوں نے اُسے دیکھا تھا۔ اور پہلی بار ایسا دکھائی دے رہا تھا۔ کہ اُسے پھانسی کی سزا ملجائے گی۔ اور ہمیشہ کے لئے انہیں دیکھنا نصیب نہ ہو گا! اسلئے بہت سے آدمی ہلنے تک نہیں ویسے ہی بیٹھے رہے۔ باہر کی بھیڑ میں سے کچھ آدمی افسوس کرنے لگے۔ لیکن کھڑے سب رہے۔ ہزار ہا کی بھیڑ تصویر بنی کھڑی تھی۔

پتہ نہیں کیوں ہر ایک آدمی صحرائی کے لئے بیقرار تھا۔ کیا اُسے پھانسی دیدی جائیگی؟ کیا دنیا کے اس بے نظیر شاعر کو فنا کر دیا جائیگا؟ ہر ایک آدمی چُپ چاپ دعا کر رہا تھا۔ کہ صحرائی بچ جائے۔

اُسی وقت سرکاری وکیل ڈپٹی صاحب کے کمرے میں گیا۔ لوگ سانس کھینچکر اُسکے آنے کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ باہر آیا! اور اس نے آہستہ سے دھیمی آواز میں کہا۔ عدالت کا فیصلہ ہے۔ کہ مسٹر طاہر کی موت خودکشی سے ہوئی۔ مرحوم بیگم ایلینہ رہا کی جاتی ہیں۔ اور مسٹر صحرائی تم جا سکتے ہو ———"

پتہ نہیں صحرائی نے ان الفاظ کو سُنا یا نہیں سُنا...... لیکن لوگوں نے خوشی سے چلا کر کہا:۔

"شاعر صحرائی زندہ باد"

عدالت کے اندر باہر ایک ہلڑ سا مچ گیا۔ ہر طرف سر ہی سر نظر آنے لگے۔ لوگوں کے جوش کی کوئی انتہا نہ تھی۔ انہوں نے چلا کر کہا۔

شاعر صحرائی زندہ باد"

اور پتہ نہیں۔ کب کسی نے صحرائی کو پکڑا! اور اُسے عدالت سے باہر لے آیا۔

ایک موٹے تازے آدمی نے اُسے کندھے پہ بٹھا لیا۔ اور ایک اُونچی جگہ پر کھڑے ہو کر کہا۔ "دنیا کا عظیم ترین شاعر زندہ باد" اور پھر پتہ نہیں۔ کسی نے اُسے ایک موٹر میں بٹھا دیا۔ موٹر کے چاروں طرف ہزارہا انسانوں کا سمندر اُٹھلا رہا تھا۔ اور بار بار آسمان کو گونجاتی ہوئی ایک صدا سنائی دیتی تھی۔

"شاعر صحرائی زندہ باد"

لیکن صحرائی دھیرے دھیرے بیہوش ہو رہا تھا۔ بیہوشی ہی بیہوشی میں ایک بار اُس نے کہا۔ اینہ...... لیکن کسی نے بھی اُسکی اس کمزور آواز کو نہیں سُنا۔ اُنہوں نے چلا کر کہا:۔ "غریب صحرائی زندہ باد"

ایک جلوس سا بن کر شہر کے بڑے بازاروں سے جانے لگا۔ کچھ جوشیلے لڑکوں نے صحرائی کا ایک پُرانا گیت گانا شروع کر دیا۔ بیچ بیچ میں کوئی زیادہ منچلا آدمی چلا اُٹھتا تھا۔

شاعر صحرائی ——— زندہ باد

لیکن اچانک موٹر کھڑی ہو گئی۔ ڈرائیور نے دھیرے سے کہا:۔

"ارے نہیں دیکھو تو"

لوگوں نے دیکھا۔ صحرائی کا سر لڑھک گیا تھا.......

اُس کی جان نکل گئی تھی۔

جلوس رُک گیا۔

لیکن دُور کے چند آدمیوں نے کچھ بھی نہ سمجھ کر کہا:۔

"شاعر صحرائی زندہ باد"

قبرستان میں خاموشی تھی۔ دو جنازے وہاں پہنچے۔ اُسکے ساتھ ہزارہا اشخاص تھے۔ لیکن سب خاموش۔

رات کی تاریکی میں عدم آباد کے مسافر سوئے ہوئے تھے۔ اور دو آدمی آہستہ آہستہ دو قبروں کے پاس پہنچے۔ جو پاس پاس تھیں۔

ایک نے کہا، "کون ؟"

دوسرے نے کہا، "میں ہوں ڈپٹی صاحب چراغ"

اور پھر ایک بوڑھے آدمی کی سسکیوں نے قبرستان کی خاموشی کو توڑ دیا۔ اُسی وقت دُور پر سے ایک درخت پر کوئل نے کہا——کُو اُو——کُو اُو——

طلائی مہر

احمد ندیم قاسمی

ہڈیاں چٹخیں، پسلیاں چرچرائیں۔ اور سُوکھے گلوں سے پژمردہ چیخیں بلند ہوئیں
"ایسا کبھی نہیں ہو سکتا!"

اور اب پٹواریوں اور نمبرداروں کے ہجوم میں سے تھانیدار اپنی پگڑی کو ٹیڑھا کرتے ہوئے نکلا اور کڑکا۔ "ایسا ضرور ہو گا۔ یہ میرا حکم ہے۔ اور میرا حکم اس علاقے کا قانون ہے۔ مہینہ بھر کے لئے تم اپنی زمینوں میں ہل نہیں چلا سکتے۔ نہ تم کھیتوں کی دیکھ بھال کر سکتے ہو۔ نہ گوبھی کی کیاریوں کو پانی دے سکتے ہو۔ تم نے ڈاکوؤں کو پناہ دے رکھی ہے۔ اور جب تک تم اپنے کئے کی سزا نہیں بھگتو گے تمہارے ہوش ٹھکانے نہیں آئیں گے۔ تم لاتوں کے بھوت ہو!"

ایک پھٹے ہوئے چولے والا نوجوان مجمع کو چیر کر آگے بڑھا۔ اسکے گلے کی رگیں پھولی ہوئی تھیں بازوؤں کے پٹھے تن گئے تھے۔ اور رنگ چقندر کی طرح لال تھا۔ وہ تھانیدار کے مقابل جا کر پکارا "لیکن ہم تباہ ہو جائیں گے۔ ہم مر جائیں گے ہم غریب آدمی ہیں۔"

اور مجمع سے دبی دبی آوازیں آئیں "اے فیض، فیض! کیا کرتے ہو۔ پیچھے

لے پنجابی میں ماتھے کے جھومر کو کہتے ہیں۔

ہٹ آؤ"۔

اور سامنے سے تھانیدار نہایت تند لہجے میں اسکی ماں اور بہن کی آبرو ریزی کرتا ہُوا دھاڑا ۔" یہ منہ پھٹ چھوکرا کون ہے ؟ بد زبان، بے حیا۔ ارے تم غریب ہو۔ تو یہ تمہارے اپنے ماتھے کا لکھا ہے۔ تمہاری غریبی میرے حکم کی راہ میں روڑا بنکر کیوں لٹکے ؟ کل شام تک تم سب اپنے جھونپڑے چھوڑ چھاڑ کر گاؤں میں جا بسو۔ پورے ایک مہینے تک نہ ہل چلاؤ۔ نہ کھیتوں کی دیکھ بھال کرو، نہ گو بھی کو پانی دو۔ ورنہ تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔ میرے بلیتوں کی ضرب اس قدر سخت ہے کہ بے شمار بدمعاش آج تک ماتھے پر پٹیاں باندھے میرے سائے سے چھپتے پھرتے ہیں"۔

ایک بوڑھا کھوسٹ پرلی طرف ایک بیری کے تنے کا سہارا لیکر اُٹھتے ہوئے بولا۔

"ہم پر رحم کیجئے۔ ہم پر رحم کیجئے مالک"۔

اور تھانیدار پلٹ کر جاتے ہوئے بولا "میں پتھر ہُوں۔ اور پتھر رحم نہیں جانتا میرا حکم اس علاقے کا قانون ہے"!

اور دُور سفید بادل کے سائے میں ایک باز ایک بھٹکے ہُوئے نیلے کبوتر پر جھپٹا۔ اور اسے پنجوں میں دبوچ کر تُنچے کھچے پر فضا میں بکھیرتا تھانے کی کالی عمارت کی طرف اُڑ گیا۔

ان دنوں علاقوں میں دو ڈاکو پھر رہے تھے۔ جنہوں نے قرضے کے بوجھ سے تنگ آکر گاؤں کے ایک سیٹھ کا پیٹ چاک کر دیا۔ اور لمبی لال پوتھیاں جلا دیں کئی بار ایسا ہُوا کہ مفرور پولیس کی زد میں آ گئے۔ مگر پولیس والوں کو معلوم تھا کہ

انکے پاس سرحد پار کی بندوقیں ہیں۔ اور انکی بے پناہ نشانہ بازی کے چرچے تو دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ وہ ڈاکوؤں کی آمد کی خبر پاتے ہی وردیاں پہنتے اور پیٹیاں کسنے لگتے۔ اور ڈاکو اندھیری گھاٹیوں کے گہرے غاروں میں دبک جاتے ——— اور پھر اوپر رپورٹ بھیجدی جاتی۔ کہ گاؤں والے ڈاکوؤں کو چھپائے رکھنے پر متفق ہو گئے ہیں۔ لیکن ان پر مناسب دباؤ ڈالا جا رہا ہے عنقریب انہیں زبردست زک پہنچے گی ——— گاؤں پر پچھلے دو مہینوں سے تعزیری چوکی کا دلیہ بھی مسلّط کر دیا گیا۔ اور وہ لوگ جو صبح جو کی روٹی کھولتے ہوئے پانی کے ساتھ نگل کر شام کے کھانے کی فکر میں غرق ہو جاتے تھے۔ ہر مہینے کچھ رقم مہیا کرنے پر مجبور کر دیئے گئے! اس سلسلے میں اتنا سننے میں آیا۔ کہ ایک بوڑھا اپنی کنواری بیٹی کا رات بھر غائب رہنا صرف اسلئے برداشت کر لیتا ہے کہ صبح سویرے اسکی ڈبڈباتی آنکھوں والی لڑکی اسکی ہتھیلی پر چوّنی یا اٹھنّی رکھ دیتی ہے اور ایک بڑھیا جس کا خاوند مر چکا تھا اور بیٹے کی بنا پر پھانسی چڑھ گیا تھا کھاتے پیتے لوگوں کا غلہ پیستے پیستے چکی کے پاٹوں پر سر رکھ کر ٹھنڈی ہو گئی! اور جب اس قدر سختی کے باوجود ڈاکوؤں نے خود بخود تھانے آکر اپنے آپ کو پولیس کے حوالے نہ کیا تو اوپر سے حکم لیا گیا کہ گاؤں سے باہر جو لوگ کھیتوں کی حفاظت کیلئے جھونپڑوں میں رہتے ہیں، ڈاکوؤں کو پناہ دیتے ہیں! اسلئے انہیں ہل چلانے، کھیتوں کی دیکھ بھال کرنے، اور گوبھی کی کیاریوں کو پانی دینے سے روک دیا جائے تاکہ وہ اس دباؤ سے تنگ آکر سرکار کا ہاتھ بٹا سکیں۔

زمینیں ٹھنڈ سے اکڑ گئیں! کھیت مرجھا گئے! گوبھی کے پھولوں پر گرد جم گئی

لیکن حکمِ حاکم مرگِ مفاجات۔ چپ سادھے بیٹھے رہے۔ کبھی کبھی دبے پاؤں اپنے کھیت دیکھنے چلے جاتے۔ اور مینڈھوں کی خشک گھاس پر جمی ہوئی یخ کی چادر اُنکے پاؤں کے نیچے چٹختی تو اُنکے کلیجے کٹ جاتے۔ اور جب گوبھی کے مرجھائے پتوں پر زردی بکھری ہوئی دیکھتے تو اُنکے روئیں روئیں سے چنگاریاں جھڑنے لگتیں۔

لیکن اِسقدر تباہی کے باوجود فیض کی کیاریاں اسی آن بان سے لہلہاتی رہیں۔ اور جب شام کو تاروں بھرے آسمان کے بالمقابل ٹنڈ منڈ بیریوں کے آبنوسی سائے جم کر رہ جاتے۔ اور جب جھیل کے اسطرف کوئی بھٹکی ہوئی مرغابی کنارے کی گھاٹی میں پھڑپھڑاتی ہوئی گھس جاتی تو فیض گھر سے باہر نکلتا اور دیواروں سے لگ لگ کر چلتا۔ جھاڑیوں کے پیچھے دبکتا، آباد راہوں سے کتراتا، اپنے کنوئیں پر چلا جاتا ہے۔ اور اِس میں ٹین کا ڈول لٹکا لٹکا کر پانی نکالتا اور گوبھی کی کیاریوں کو لبریز کر کے موٹے موٹے چاندی ایسے پھول اُکھیڑ کر ایک ٹوکرا بھرتا اور قصبے کے بوڑھے سبزی فروش کے ہاں پہنچا کر گاؤں لوٹ آتا۔ اور جب جھٹپٹے کے وقت لوگ مسجد کی طرف جانے اور دن چڑھے واپس آتے تو فیض کو اپنی جھکی ہوئی ڈیوڑھی کے اندر بھوری گائے کے اُسطرف ایک موٹا کمبل اوڑھے خراٹے بھرتا پاتے۔

فیض گاؤں بھر میں ایک شرمیلا اور کم ہمت نوجوان سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اپنے دوست فتحدین کے بیاہ میں شریک ہونے کے بعد اچانک اسکے دل نے ایک جھرجھری لی اور دوسرے روز اُس نے اپنے ایک دشمن پر ایک گلی میں بے دھڑک آوازے کس دیئے۔ اسکے ہم عمر دوست بہت سٹ پٹائے اور فیض کی فطرت کے اِس زبردست پلٹے پر قسم قسم کی خیال آرائیاں کیں۔

" کہیں سے پستول ہاتھ لگ گیا ہو گا!"

" ایکے اسکی گو بھی کی کیاریاں آباد ہیں نا!"

اور اس قسم کی وغیرہ باتیں۔ لیکن اصل بات کسی کو نہ سوجھی۔ اور وہ بات بہت چھپی چھپی تھی۔ کیونکہ اس بات کو صرف فیضؔ اور سوُنی ہی جانتے تھے۔

سوُنی گاؤں کے بوڑھے چوکیدار کی لڑکی تھی۔ بہت شرمیلی اور سمٹی سمٹی جیسے گلاب کی کلی جو سُورج کی روشنی اور گستاخ جھونکوں سے لجائے اور پتیوں میں چھپ چھپ جائے! باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اسلئے اپنی مرضی کے مطابق بنی ٹھنی رہتی تھی۔ گلابی پاؤں میں سبز چمڑے کا جوتا، پیلی چھینٹ کا لہنگا۔ جاپانی اُودے ریشم کی قمیض سر پر تاروں بھری اوڑھنی۔ ناک میں چاندی کی موتی ایسی کیل۔ کانوں میں جھمر جھمر کرتے بندے، جن کے نیچے شبنم کے قطرے لس لس کرتے رہتے گلے میں ہنسلی جس سے چاندی کے گھنگرو لٹکے رہتے۔ گوری گوری باہوں میں دھانی دار چوڑیاں اور پھر پاؤں میں سبز جوتوں کے اُوپر ٹخنوں سے لپٹی ہوئی جھانجنیں جو ہر قدم پر ایسا دلآویز چھنا کا پیدا کرتی تھیں جیسے بلبیثمار کوئلیں نیم کے چھتناروں میں چھپی رُک رک کر کوکو پکار رہی ہوں!

فیضؔ، فتحدین کی شادی پر اپنا بہترین لباس پہنے اپنے دوستوں کے ہمراہ چھت پر بیٹھا کنواریوں کے گیت سُن رہا تھا۔ آٹھ دس لڑکیاں ملکر گاتیں۔ جوان میراثن ڈھولک بجاتی، دانت نکالتی اور جھومتی۔ اور جب گیت کا آخری سُر نازک گلوں میں مدھم ہوتے ہوتے ختم ہو جاتا۔ تو ڈھولک کی دھما دھم دھپ کے ساتھ نئے گیت کی ابتدا ہو جاتی۔ کوٹھوں پر گاؤں والے دبکے بیٹھے تھے۔ اور ٹنڈ منڈ بیریوں اور نیموں میں شریر

بچے چھپے، گیت سن رہے تھے۔ اور نیچے صحن میں لال اور پیلی اوڑھنیاں اور اودے اور گلابی لہنگے لالٹینوں کی پیلی روشنیوں میں مٹتی ہوئی قوس قزح کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ ایک نیا گیت شروع ہوا میراثن کی انگلیاں ڈھولک پر والہانہ رقص کرنے لگیں۔ اور لڑکیوں کی پتلی پتلی آوازیں بلند ہوئیں۔ جیسے کوئی سازندہ آٹھ دس سارنگیاں کو وہیں دبائے بیک وقت آٹھ دس تاروں کو جھنجھنا رہا ہو۔ کہ اچانک سب لڑکیاں خاموش ہو گئیں اور سارے نٹیالے منظر کو ایک تنہا آواز کا تیر نشتر چیرتا ہوا افق کی طرف اڑ گیا۔ الفاظ فضا میں کروٹیں لینے لگے۔

"ترس ترس کر جی اور ہنس ہنس کر مر

کہ تڑستی زندگی اور ہنستی موت ——!"

اور اچانک آواز رک گئی۔ اور گانے والی کو احساس ہوا کہ شریر لڑکیاں اسکی آواز سننے کے لئے چپ ہو گئی ہیں اور وہ اس سازش پر غصے اور شرم کے ملے جلے جذبات سے سہمی سہمی گنگنانے لگی۔ اور لڑکیاں جھک جھک کر اور لیٹ لیٹ کر اسقدر ہنسیں کہ جیسے سارے اندھیرے منظر میں ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر گئے!

چھت پر بیٹھے ہوئے نوجوان ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

ایک بولا "آواز تھی یا سونے کا ایک تیر تھا۔ جو دلوں کو چیرتا ہوا پار ہو گیا۔"

دوسرے نے کہا "آواز تھی یا اس کبوتر کی اڑان تھی جسکے پنجوں سے گھنگھرو بندھے ہوئے ہوں۔"

اور ایک طرف سے فیض دبی آواز میں بولا "آواز تھی یا شفاف تالاب کی

میں چاندی کی گھنٹیاں بج اٹھیں"۔

نوجوان رُک رُک کر ہنستے ایک دوسرے سے لپٹ گئے اور فیض کو ٹھوکا دیتے ہوئے بولے :۔

"کچھوا، اور ناچے"!

"بلبند ملک، اور ملہار گائے"!

چھچھوندر، اور سر میں چنبیلی کا تیل ڈالے"!

اور فیض اپنی ذرا ذرا سی مونچھوں پر انگلی پھیرتے ہوئے بولا۔

"بھئی ہمارے بھی دل ہے"!

اور سب نوجوان چُپ ہو گئے۔ جیسے انہیں فیض کی یہ دلیل پسند آئی ہو۔ اتنے میں منڈیر کے قریب سے ایک نوجوان سر اُٹھا کر بولا۔

"لیکن یہ بھئی کون"؟

"سُونی"!

"سونی"؟

"ہاں، چوکیدار کی لڑکی۔ وہ جو بھڑکیلے کپڑے پہنتی ہے۔ اور لجائی رہتی ہے"۔

"ہاں ہاں، وہ بجلی"۔

"اچھا وہ جادوگرنی"۔

اور جب آدھی رات کو لوگ ہولے ہولے اُٹھنے لگے، اور لڑکیاں بھی لمحہ بھر کے لئے آرام کرنے کے لئے سو گئیں، اور کچھ اپنے اپنے گھروں کو چل دیں، تو فیض ایک اندھیری تنگ گلی میں یہ سوچتا جا رہا تھا کہ بعض لوگوں کی آواز میں کتنی

مٹھاس ہوتی ہے۔ جیسے کانوں کے رستے کوئی شہد کے گھونٹ پلا رہا ہے! اور اس کا جسم تپ گیا۔ اور دل تڑپنے لگا۔ اور اسے محسوس ہوا کہ اسکا یہ اِن کو بنکر بیٹھے رہنا اس جوانی کے ماتھے پر کالا بدنما داغ ہے اور سونی یا کسی الھڑ لڑکی کو یا ہوں پر ڈالکر اندھیری گھاٹیوں میں دھیرے دھیرے ترستی زندگی اور ہنستی موت کے گیت گانے میں جو کیفیت ہے وہ آرام سے ٹھنڈی ہوا کے ہلکوروں میں لمبی تان کر سونے میں بھی نہیں۔

چونکہ اسکا گھر گاؤں کے پرلے سرے پر تھا اسلئے اُسے یہ انوکھی باتیں سوچنے کیلئے بہت وقت مل گیا اور جب وہ پرانے قبرستان کی ٹوٹی ہوئی دیوار کے قریب سے گزر رہا تھا تو چر چر کرتے جھینگر اچانک چُپ ہو گئے۔ اور ٹڈیاں اپنی طویل اور باریک پیں پیں کو روک کر دم بخود رہ گئیں۔ ساری فضا پر ایک خوفناک خاموشی چھا گئی۔ کہ اچانک فیض ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اُسے کانچ کی چوڑیوں کی آواز سنائی دی —— اور اسے احساس ہوا کہ کوئی لڑکی اس سے دس بارہ قدم کے فاصلے پر میٹھی چوڑیاں کھنکھنا رہی ہے۔ اور یہ کھنکھناہٹ فیض کو فتحدین کے صحن میں لے آئی! اور پھر وہ گزرتی ہوئی ڈھولک اور جھومتی ہوئی میراثن وہ رنگا رنگ لباس اور وہ چوڑیاں —— اور پھر سُونی کی آواز، جو اندھیرے منظر کو چکا چوند کرتی اُفق کی گود میں سو گئی —— اور اسے ترستی زندگی اور ہنستی موت کا خیال آیا —— موت اور ٹوٹی ہوئی قبروں والا قبرستان! —— سُوکھے ہوئے ڈھچر اور خوفناک ڈائنیں، جو راتوں کو چوڑیاں بجاتی ہیں، اور شکستہ دیواروں کے سوراخوں میں راہ چلتوں کو دبوچنے کی تاک میں چھپی رہتی ہیں۔ لمحہ بھر کے لئے اسکے دل پر جیسے برفانی گالے پڑ گئے! لیکن اچانک ایک اضطراری حالت میں وہ گرج کر پکارا:۔

"کون ہے تو؟"

"سوہنی" آواز آئی۔ اور فیض کو محسوس ہوا۔ کہ واقعی قبرستان کے ایک کونے پر چھوٹے سے گڑھے میں پانی جمع ہو گیا ہے۔ اسکے نیچے کسی سوئی ہوئی جل پری کا نیلے جس کی کلائیوں پر چاندی کی ننھی ننھی گھنٹیاں سج رہی ہیں۔ کہ وٹ بدلی ہے جسم کے ہر مسام سے پھوٹتا ہوا پسینہ اور پسینے کے ہر قطرے میں مچاتی ہوئی چنگاریاں اور دھکتا ہوا اور پھنکتا ہوا بدن اور رقص کرتی ہوئی روح!۔۔۔۔ فیض کے اوسان لڑکھڑائے اور اس اندھیرے منظر کی خنک تنہائی میں اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ سوہنی کے ہمراہ کسی دور دراز ملک کی طرف اُڑا جا رہا ہے۔ اس حالت میں کہ سوہنی کا سر اسکے کاندھے پر ہے۔ اور اسکی زلفیں فضا میں مسحور ناگنوں کی طرح لہرا رہی ہیں۔ اور اس کے ٹخنوں کی جھانجنوں کے چھناکے سے فضا گنگنا رہی ہے!

اچانک جھینگروں اور ٹڈوں کی مسلسل تانیں خاموش نظاروں پر نشتر زنی کرنے لگیں، اور فیض اس قبرستانوں اور تاریکیوں کی دُنیا میں لوٹ آیا۔ اور بولا۔

"یہاں کیا کر رہی ہو سوہنی؟"

اور سوہنی بھرائی ہوئی آواز میں بولی "یہاں میری سونے کی مُہر گر پڑی ہے۔ میں نے یہ مُہر جاگیردار کی بیٹی سے آج رات کے لئے لی تھی۔ اور میں اب قعدین کے گھر سے اُٹھ کر آ رہی تھی کہ یہاں مجھے چند ایک سہیلیوں نے چھیڑا۔ اور ٹھٹے مخول میں مجھے مُہر کا خیال نہ رہا۔ اور جب میں گھر پہنچی تو ہاتھ کو خالی پا کر میرا دل دہل گیا۔ واپس آ کر یہاں اندھیرے میں خاک پہ ہاتھ پھیر رہی ہوں ڈرتی

ہٹوں پھر لڑھک کر ادھر دھنسی ہوئی قبروں میں گر گئی تو کب ملے گی۔ اور مجھ پر باپ بہت خفا ہوگا۔ کہ میں نے دم بھر کی رونق کے لئے ایسا غضب ڈھایا۔"

فیض کا جی بھر آیا جیب سے ڈبیا نکالی اور ایک دیاسلائی روشن کی۔ پہلی نظر سوُنی کے ماتھے پر پڑی۔ جس کے عین وسط سے سیدھی مانگ لپک کر اوپر اوڑھنی میں چھپ گئی تھی! اسکی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ اور پتلے پتلے ہونٹ کھلے ہوئے تھے۔ اسکی مکھن ایسی کلائیوں میں کانچ کی چوڑ یاں پڑی ہوئی تھیں۔ اور اسکے ہاتھ خاک آلود تھے۔

"فیض"! وہ تعجب سے پکاری! اور فیض خوشی سے ہانپنے لگا۔ کہ سونی اسکا نام جانتی تھی۔ اور کسی دوشیزہ کو ایک نوجوان کا نام یاد رہنے کا یہ مطلب ہے کہ اس نوجوان میں کوئی خصوصیت ہے۔

پھر پھر دیاسلائیاں جلنے لگیں اور زمین پر بجھتی ہوئی چنگاریوں کے ڈھیر لگ گئے۔ اور آخر کار فیض ایک قبر کے کنارے جلی ہوئی جھاڑیوں کی جڑ میں سے مُنہا اُٹھا لایا۔ اُسے قمیض سے پونچھا اور سونی کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔" لو سونی، شکر ہے مل گئی"۔ اور جب اسکی خاک آلود انگلیاں سونی کی خاک آلود انگلیوں سے مس ہوئیں تو اندھیرا اور زیادہ گہرا ہو گیا۔ ٹڈیاں چیخ اُٹھیں اور جھینگر بلبلانے لگے اور دونوں نے محسوس کیا کہ انکے جسم کپکپا رہے ہیں۔ انکی آنکھیں ڈبڈبا آئی ہیں! اور انکی انگلیاں پسیج رہی ہیں۔

کانپتی ہوئی آواز میں سونی بولی "تم نے بہت تکلف کی قبرستان کے کنارے قبروں کے درمیان ہاتھ پھیرتے پھرنا بہت حوصلے کا کام ہے"!

اور فیض بولا "اور یہ کتنا عجیب اتفاق ہے کہ ہماری ملاقات قبرستان کے کنارے اور قبروں کے درمیان ہوئی ——— اور سوہنی یہ اندھیرا کتنا گہرا اور گاؤں کتنا خاموش ہے ——— اور سوہنی، تم نے وہ ترستی زندگی اور ہنستی موت کا گیت کتنا اچھا گایا تھا ——— لیکن سوہنی تم شرما کیوں گئی تھیں ——— اور تم اب کس رستے سے گھر جاؤ گی، کہو تو میں تمہارے گھر پہونچا آؤں ——— اور سوہنی ——— سوہنی، تم میرا نام کیسے جانتی ہو؟"

اور سوہنی اندھیرے میں ٹوٹی ہوئی دیوار پر ہاتھ رکھکر اُٹھتی ہوئی بولی "میں تو تمہارا نام مدت سے جانتی ہوں۔ کیونکہ تم میری پھوپی کے پڑوس میں رہتے ہو"

اور فیض یہ بھولا بھالا جواب سُنکر جھینپ سا گیا۔ اور بولا "اکیلی جاؤ گی؟"

"ہاں کیا ہرج ہے۔ اودھر جاگیردار کا کتا کبھی کبھی جھپٹ پڑتا ہے۔ ورنہ کیا ہرج ہے!"

اور پھر جب فیض اُسے ٹوٹی ہوئی کھڑکی کے پاس پہنچا کر واپس لوٹنے لگا تو سوہنی بولی "تم نے بہت تکلیف کی!"

بہت پرے ایک گلی کے نکڑ پر بیٹھا ہوا بوڑھا چوکیدار چلایا:-

"خبردار بھائیو" ——— اور فیض نے آہستہ سے کہا "تمہارا باپ جاگ رہا ہے ہولے ہولے چلو۔ تمہارے ٹخنوں کی جھانجنوں کا چھناکا نہ سُن لے!" ——— اور فیض نے محسوس کیا کہ سوہنی اندھیرے میں مُسکرا رہی ہے!

وہ رات کی وجہ سے سوہنی کو اچھی طرح نہیں دیکھ سکا تھا۔ لیکن اتنا ضرور ہُوا کہ اس کے دل و دماغ پر ایک خاص پیکر کا نقشہ جم گیا۔ جسکی مانگ ستاروں کو

گھول کر بنائی گئی تھی۔ اور جس کا خوبصورت سینہ اور اُبھرے ہوئے کولہے اور سفید ٹخنوں پر گنگناتی جھانجھنیں اور گرد آلود ہاتھ اور پتلی پتلی انگلیاں اور ـــــ اور وہ بہت سی باتیں تھیں جنکا اُسے پہلے کبھی خیال تک نہ آیا تھا۔ لیکن جواب تک ایک مکمل شکل اختیار کر کے اُسکے دماغ کی شریانوں میں نشے بنکر گھوم رہی تھیں۔

اور یونہیں زندگی کے اُڑتے ہوئے لمحوں میں فیقی اور سوّنی نے چند ایسی گھڑیاں چن لیں۔ جن میں انکے دھڑکتے دل رُک جاتے۔ اور جھپکتی آنکھیں ایک دوسرے کو گھورتی رہ جاتیں۔ اور سوّنی گلیوں میں سینہ تانے، بازو لہراتی، آنچل پھڑپھڑاتی کوندے کی طرح لپکتی ہوئی ہرنی پھرتی گلیوں میں غائب ہو جاتی! اور فیقی ننھی ننھی مونچھوں کو بل دیکر ایسے ایسے پتھر اُٹھاتا کہ کسی بیل کی پیٹھ پر کھدتے جاتے تو وہ پچک کر زمین سے لگ جاتا!

اب سوّنی کی ایک سہیلی کا بیاہ نزدیک تھا۔ اور جاڑوں کی ایک سرد رات کو جب سارے گاؤں پر ایک گہرا سا پھیلا ہوا تھا۔ وہ بکھری ہوئی کھیتیوں کے کنارے ٹنڈے چپ چاپ رہے تھے۔ ایک کھنڈر کے پاس فیقی نے سوّنی کے صاف چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں سنبھالکر اور آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر کہا ”تم اتنی گھبرا کیوں رہی ہو؟ میں لے آؤنگا تمہارے لئے سونے کی مُہر۔ میں اکیلے گوبھی کی رقم اکٹھا کر رہا ہونگا اور تمہاری سہیلی کے بیاہ سے دو چار دن پہلے کورے سونے کی ایک چمکتی دمکتی مُہر تمہارے اس چاند سے ماتھے پہ چھم چھم کرتی نظر آئے گی۔ اور سوّنی شاید تم نہیں جانتیں کہ میں اس قسم کی کتنی مُہریں تمہارے قدموں پہ نچھاور کر سکتا ہوں۔ اور سوّنی ـــــ سوّنی، تم کتنی اچھی ہو!“

اور سوفی نے فیض کے بالوں میں پھنسی ہوئی ننھی سی کنگھی کو اپنی اُنگلیوں میں گھماکر کہا "تمہیں تکلیف ہوگی فیض ——— اور سونے کی مُہر میں جاگیردار کی بیٹی سے مانگ لونگی۔ اور پھر اچانک اُنہیں پہلی رات یاد آگئی۔ جب جاگیردار کی بیٹی کی مُہر ایک دھنسی ہوئی قبر کے کنارے جلی ہوئی جھاڑی کی جڑوں میں پڑی ملی تھی اور پھر وہ اُنگلیوں کا آتشیں مس! اور اسکے بعد وہ خاموش راتوں کی پُر شور گھڑیاں ——— دونوں کُہرے کے دُھندلے سایوں میں ایک دوسرے کی ڈبڈبائی پتلیوں میں ماضی کا ناٹک دیکھنے لگے۔ اور تب تک دیکھتے رہے جب ایک مُرغے نے دور ایک نیم کی ٹہنی پر اس زور سے بانگ دی کہ سوفی کا جسم کانپ گیا اور فیض کی آنکھیں جھپک گئیں!

اور اب تھانیدار کے حکم سے لوگوں کو گوبھی کی کیاریوں کو پانی دینے سے روک دیا گیا۔ لیکن راتوں کو فیض کے کنوئیں سے بلا شمار ڈول چھلکتے ہوئے نکلتے اور گوبھی کی کیاریوں میں سرنگوں ہو جاتے۔ لوگ فیض سے شکایت کرتے کہ "تم چمگادڑ کی طرح دن کو کیوں سوتے ہو؟" اور فیض جواب دیتا کہ "جب انسان بیکار ہو تو رونے یا سونے کے سوا وقت کیسے کٹے"!

اور بیس دن بعد جب فیض کے پاس چودہ روپے جمع ہو گئے تو وہ قصبے کے سنار سے ایک مُہر بنوا لایا جس کے پیچھے گولا کھ چمٹی ہوئی تھی۔ لیکن جس کے سامنے سونے کا ایک نیلا پتھر جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ اور جس کے ساتھ ننھی سیپیوں ایسے پتھر اور شفاف شبنم ایسے موتی یوں لٹک رہے تھے۔ جیسے چاند کے کناروں پر کسی نے جھالر ٹانک دی ہو۔

شام کو وہ گاؤں سے آدھ میل کے فاصلے پر پہنچا تھا کہ راستے کے کنارے گنجان جھاڑیوں کے جھرمٹ میں سے چار سپاہی لپکے اور اُسے دبوچ لیا۔ وہ بہت چیخا چلایا وجہ پوچھی۔ لیکن اُسے گھسیٹ کر چوپال پر لایا گیا۔ یہاں تھانیدار گیس کی روشنی میں اپنے لمبے طرّے سمیت بیٹھا سامنے گھور رہا تھا۔ فیض کو دیکھکر اُسکے نتھنے پھول گئے اور ہنٹر اوپر فضا میں اُٹھ گیا اور پھر تڑاپ تڑاپ کا شور ـــــ اور الو کے پٹھے! کمینے! حرامزادے! بدمعاش! اور جانے کیا کیا ـــــ اور پھر ادھ موئے فیض کا گٹھڑی بنا ہوا جسم بوڑھے چوکیدار نے گھسیٹ کر ایک طرف کر دیا۔ اور تھانیدار پکارا کہ رات کو چھپ چھپ کر اس نے کیاریوں کو پانی دیا ہے۔ اور گوبھی کے پھول بیچے ہیں میرے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کا انجام تمہارے سامنے ہے۔ میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر پھر کوئی اس قسم کا بدمعاش میرے ہتھے چڑھ گیا تو میں اسکی بوٹیاں نوچکر کتوں کے آگے ڈال دونگا ـــــ میں تمہاری ماؤں اور بہنوں ـــــ اور پھر دہقانوں سے اٹی ہوئی گلیاں اچانک سنسان ہو گئیں۔ تھانیدار پیچوان کے کش لگاتا اندر گدگدے پلنگ پر دراز ہو گیا اور بوڑھا چوکیدار اُسکے پاؤں دبانے لگا۔ فیض چوپال کی سیڑھیوں سے کھسک کر اُترا اور کراہتا ہوا گلی کے اندھیرے میں چھپتا قبرستان کی شکستہ دیوار کے پاس بیٹھکر سستانے لگا۔ اور تاروں بھرے آسمان کے بالمقابل جھکے ہوئے ٹنڈ بیریوں کے آسیبی سایوں نے دیکھا کہ ایک لڑکی نے جس کے ٹخنوں سے لپٹی ہوئی جھانجھیں ہر قدم پر ایک دلآویز جھنکار پیدا کرتی ہیں اور جس کی ناک میں موتی ایسی چاندی کی کیل ہے۔ اپنی پیلی چھینٹ کے لہنگے سے اسکے زخم دھوئے اور جب فیض کی خون آلود انگلیوں نے ایک طلائی مُہر

اُس کی حنائی اُنگلیوں میں تھما دی تو اندھیرا گہرا ہو گیا۔ ستارے ماند پڑ گئے۔ ٹڈیاں اور جھینگر چیخ اُٹھے! اور ملائم، دھکے ہوئے، بھیگے ہوئے گال ایک زخم خوردہ چوڑی چھاتی پہ بہت دیر تک پڑے دھڑکتے رہے!

افسانہ نگار

محمد امین شرقپوری

وہ افسانہ نگار تھا۔ ادبی دنیا میں اسکی دھوم مچی ہوئی تھی——! آجکل لٹریچر کے اندر نفسیاتی اور فنّی خوبیاں ڈھونڈھی جاتی ہیں——مگر ٹھاکر داس ان باتوں کا پابند نہ تھا۔ اس کے افسانے سیدھے سادھے اور سوز و گداز سے لبریز ہوتے وہ زندگی کے روزمرّہ کے واقعات قلمبند کرتا، مخصوص طرزِ بیان سے چار چاند لگا دیتا جو ایک مرتبہ پڑھتا اس کا گرویدہ ہو جاتا——! وہ الفاظ کے چھوٹے چھوٹے جملوں سے زندگی کے حقائق بے نقاب کرتا۔ پڑھنے والا مصنف کے ساتھ کھو جاتا اور یہ محسوس کرتا کہ وہ کوئی خیالی تصویر نہیں دیکھ رہا۔ بلکہ حالات سے خود دوچار ہو رہا ہے لوگ اس کی ذہنی کاوشوں کو ایک لطیف شغل اور دماغی شعبدہ بازی سے تعبیر کرتے مگر انہیں کیا معلوم کہ ہر افسانے کا پلاٹ اسکی اپنی زندگی کا ایک واقعہ ہے اسکی زندگی حوادث سے لبریز تھی——!

شیاما اسکے افسانوں کی روحِ رواں تھی، وہ اسکے تصوّر میں کھویا کھویا سا رہتا شیاما کا حسین و جمیل تصوّر اسکی زندگی کا سب سے بڑا اور قیمتی سرمایہ تھا——! جب وہ مسکراتی تو وہ سمجھتا کہ آکاش کی رانی مسکرا رہی ہے۔ ستاروں کے

جھرمٹ میں چاند کی کرنوں میں ـــــ! جب اسکی ساڑھی کا پلّو شانوں پر ڈھلک کر ہوا میں لہراتا تو معلوم ہوتا کہ تصوّرات کی دیوی اَوجِ فلک پہ قوسِ قزح بن گئی ہے۔ اس نے درجنوں افسانے شیاما کے حسن کی تعریف میں لکھ ڈالے ـــــ!

شیاما کس قدر حسین تھی۔ جب وہ دماغ پر زور ڈالتا تو اُسے محسوس ہوتا کہ وہ کائنات کی سب سے حسین ترین ذی رُوح ہے۔ وفورِ جذبات سے کانپ اُٹھتا تھا۔ آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے ـــــ دل و دماغ کے پردوں میں چھپی ہوئی شیاما کاغذ پر منتقل ہو جاتی، الفاظ کا جامہ پہنکر دُنیا کے لئے کہانی بن جاتی ـــــ ایک دلچسپ کہانی!

کسے معلوم تھا کہ یہ پیارے پیارے افسانے لکھنے والا خود اپنا ہی افسانہ لکھ رہا ہے ـــــ مسلسل شب بیداریاں اور انہماک، اُسکے جسم و جان کو گھلائے ہیں وہ۔ ایک دن خود افسانہ بن جائے گا ـــــ ایک دردناک افسانہ!

دسمبر کی ایک سرد شام تھی۔ ٹھاکر داس شہر سے لوٹ کر گھر آیا ـــــ گاؤں میں ایک چھوٹی سی کوٹھڑی اسکا گھر تھا ـــــ! جہاں ایک ٹوٹی ہوئی کھاٹ پڑی تھی۔ دو تین برتن اور مٹی کے تیل کی ڈبیا، یہ اُس کا اثاثہ تھا۔ وہ ڈبیا جلا کر بیٹھ گیا۔ دیئے کی لَو ہوا سے کانپ رہی تھی۔ ٹھاکر داس قلم ہاتھ میں لئے دیکھ رہا تھا ـــــ نہایت دلچسپی سے! اس نے دیکھا جیسے اسکے سپنوں کی دیوی شیاما آنکھوں کے آگے ناچ رہی ہے ـــــ! ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا، ڈبیا گل ہو گئی ـــــ! کوٹھڑی میں تاریکی دوڑ گئی ٹھاکر داس چونک پڑا!

"چھپ گئیں شیاما؟ جب ہی تو تاریکی چھا گئی ہے ـــــ! جب چندرماں چھپ

جاتا ہے تو دھرتی پر تاریکی کا راج ہوتا ہے ——!" کہتے ہوئے اُس نے ڈبیا جلائی دروازہ بند کر دیا ——! وہ لکھ رہا تھا ——! خود اپنا افسانہ۔ خود اپنی آپ بیتی۔

کہاں چھپ گئی ہو شیاما؟ نہیں بولو گی آج ——؟"

"نہیں بولونگی ——" دور سے آواز آئی۔

"نہیں بولو گی؟ مجھ سے نہیں بولو گی، لالہ جی کیا یہاں بیٹھے ہیں جو ڈر رہی ہو شیاما آج بھی اُجلے کپڑے پہنکر آیا ہوں ——! دیکھو شیاما!"

شیاما نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ ماں سے آنکھ بچا کر نکل آئی!

بڑے پیپل کے نیچے دونوں کھیل رہے تھے ——!

"شیاما کیا کل بھی کھیلو گی میرے ساتھ؟"

کیوں نہیں ٹھاکر؟ آج تو تم بڑے اچھے کپڑے پہنکر آئے ہو؟"

"ہاں شیاما تم نہ کہتی تھیں کہ لالہ جی بگڑتے ہیں، میرے ساتھ کھیلنے سے منع کرتے ہیں، آج میں نے ماں سے کہا تھا، ماں میں اچھے کپڑے پہنکر جاؤنگا —— پھٹے کپڑے پہنتا ہوں، اسلئے لڑکے میرے ساتھ نہیں کھیلتے ——! کہتے ہیں تو بھنگی اور چمار ہے ——! بھنگی ایسے ہی کپڑے تو پہنتے ہیں پھٹے پرانے ——!

ماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ——!

بولی "بیٹیا اچھے لتے کہاں سے لا کر دوں —— تیرا پتا زندہ نہیں ہے محنت مزدوری سے جو کماتی ہوں۔ تمہارے منہ میں ڈالدیتی ہوں" پھر وہ بھرا کر بولی "جس کا پتا زندہ نہیں ہوتا، لوگ اُسے بھنگی چمار بتاتے ہیں ——" میں نے کہا۔

" وہ لتے پہنا دو جو ہولی کے لئے رکھے ہیں ——!

"ہٹ آج پہن لیگا تو ہولی کے دن کہاں سے لاکر دونگی"!

میں رو پڑا ۔"نہیں ماں" ۔ لسبور کر بولا ۔"اچھا پہن لے مگر ابھی اتار دینا"۔۔۔۔!

اچھے ہیں نا شیامو!"

شیامو اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی ۔۔۔۔۔ گاڑھے کے معمولی کپڑے پہنکر ٹھاکر کس قدر خوش تھا ۔۔۔۔۔!

"پتا جی آرہے ہیں ۔۔۔۔!" وہ چونک کر بولی ۔ ٹھاکر نے گھوم کر دیکھا ۔۔۔۔۔! "کہاں؟"

"وہ دیکھو ۔۔۔۔!" اس نے اُنگلی کے اشارہ سے کہا!

"شیاما تو نہیں مانے گی؟ پھر کھیل رہی ہے اسکے ساتھ ۔۔۔۔؟"

لالہ جی چلّا کر بولے ۔۔۔۔! شیاما بھاگ گئی، ٹھاکر وہیں کھڑا تھا ۔

کیوں بے، نہیں مانے گا تو ۔۔۔۔؟" لالہ جی نے ٹھاکر کے کان کھینچکر کہا ۔۔۔۔!

اب نہیں کھیلونگا ۔۔۔۔!" وہ بلبلا کر بولا ۔

بھاگ جا شریر ۔۔۔۔! وہ کان ملتا ہوا گھر آیا ۔۔۔۔!

"ماں! لالہ جی نے آج میرے کان کھینچے ہیں ۔۔۔۔!"

"کیوں؟"

"میں شیامو کے ساتھ کھیل رہا تھا!"

"کیوں کھیل رہا تھا اُسکے ساتھ؟"

دس برس کا ٹھاکر ماں کی بات کا جواب نہ دے سکا ۔۔۔۔!

"اُتار دے کپڑے ۔ ابھی سے میلے کر لایا ۔۔۔۔!" ماں بولی ۔

ٹھاکر نے کپڑے اُتار دیئے ——— میلی صدری اور پھٹی دھوتی پہن لی ——!

اُس دن کے بعد شیاما نے ٹھاکر کے ساتھ کھیلنا بند کر دیا ——!

دن گذر رہے تھے ——! ٹھاکر سولہ برس کا ہو گیا اور شیاما چودہ برس کی ——! ٹھاکر داس لکھتے لکھتے رُک گیا ——! قلم دانتوں تلے دبا کر سوچ رہا تھا ——! اس کہانی کو شیاما بھی پڑھے گی کیا؟ شاید وہ پرچہ شیاما کے ہاتھوں تک پہنچ جائے ——— اس نے پھر لکھنا شروع کیا!

چودہ برس کی شیاما کس قدر حسین تھی! اسکا مکھڑا چندر ماں کو شرماتا تھا ایشور نے ساری دھرتی کا روپ اُسے دان کر دیا! ٹھاکر اسکے حُسن کے گُن گاتا تھا ——! شیاما اب اس سے بات بھی نہیں کرتی تھی ——! ٹھاکر پہروں اُسکے تصوّر میں پیپل تلے بیٹھا رہتا ———!

"ماں!" وہ ایک دن بولا "میرا بیاہ نہیں کرو گی؟"

ماں ہنس پڑی ——!

"بٹیا تیرا بیاہ کروں گی!"

"کب؟"

"جب تو کمانے کے لائق ہو جائے گا!؟"

"کس سے کرو گی؟ ماں نے تعجب سے دیکھا۔

جو تمہارے بھاگ میں ہو گی؟"

"نہیں ماں! میں شیاما سے بیاہ کرونگا ——؟

"نہیں بیٹا! شیاما بڑے گھر کی بیٹی ہے —! اُسکا باپ دھن وان ہے، دھن وان کی بیٹی غریب کے گھر نہیں آتی —!"

"کیوں ماں؟"

"تو ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتا!"

"ماں میں لالہ جی سے کہونگا!"

"ایسی بات نہ کہنا بیٹا! گاؤں سے نکال دینگے —!"

ٹھاکر شش و پنج میں پڑ گیا —!

لالہ جی چوپال میں بیٹھے حقہ پی رہے تھے —! ٹھاکر ڈرتے ڈرتے ان کے پاس آیا —!

"کیوں کیا بات ہے؟" وہ بولے

"لالہ جی — میں شیاما سے بیاہ کرونگا —؟" لالہ جی چونک پڑے "کیا کہہ رہے ہو —! چھوٹا منہ بڑی بات —! خواب دیکھ رہے ہو کیا؟ ایسا طمانچہ دونگا کہ پتہ بھی نہیں چلے گا —؟" لالہ جی کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔!

ٹھاکر کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے —!

"معمولی پڑھے لکھے ہو — کہیں دس پندرہ کے نوکر ہو جاؤ گے — بس یہی ہے نا تمہاری اوقات! شیو رام کی بیٹی کسی دھن وان کے گھر جائیگی —!"

ٹھاکر اپنا سا منہ لیکر چلا آیا —! آج اسے معلوم ہوا کہ یہ سوداکس قدر مہنگا ہے! آج اسے محسوس ہوا کہ غربت اور ناداری انسان کے لئے کتنی بڑی لعنت ہے!

دنیا میں غریب کی آشا کبھی پوری نہیں ہوتی —! شیاما دھن وان کی بیٹی ہے ہاں

ٹھیک کہتی تھیں —— ! بڑے گھر میں جائیگی —— بڑا گھر! جہاں سکھ اور آنند ہو، دولت ہو، دولت کے بغیر سکھ اور چین میسر نہیں —— ! ٹھاکر جسکی ماں مزدوری کرتی ہے جس کا باپ اُسے بچپنے ہی میں چھوڑ کر مر گیا —— مفلس و قلاش ہے —— ! شیاما اُسکی نہیں ہو سکتی۔ ٹھاکر کی آشاؤں پر پانی پھر گیا —— !

تھوڑے ہی دنوں بعد شیاما کا بیاہ ہو گیا۔ کسی بڑے شہر سے بڑے آدمی کی برات آئی —— دھوم دھام سے شیاما کو بیاہ کر لے گئی —— !

ٹھاکر سے شیاما چھین گئی —— ! وہ بڑے گھر کی بیٹی تھی۔ بڑے گھر میں چلی گئی —— ! مگر اُسے کیا معلوم کہ ٹھاکر اب بھی اسکے نام کی مالا جپ رہا ہے —— ! وہ رو رہا ہے شیاما کے پریم میں !

ماں نے کہا " بیٹا یوں رونے سے فائدہ ؟ میں تیرا بیاہ کروں گی "!

" اب بیاہ سے کیا ہو گا —— میں بیاہ نہیں کرونگا ماں —— ! غریبوں کا بیاہ نہیں ہوتا —— "! ماں کا دل ٹوٹ گیا —— ! ٹھاکر گھر سے غائب رہنے لگا —— ! ماں اسی غم میں گھل گھل کر مر گئی ! ماں کے مرنے کے بعد ٹھاکر اس دنیا میں اکیلا تھا —— ! محنت مزدوری سے پیٹ پال رہا تھا —— ! مگر شیاما کی محبت اُسے گھن کی طرح کھا رہی تھی —— !

رات کی تاریکی میں جب ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے چلتے، شیاما کی یاد اس کے دل میں چٹکیاں لیتی —— ! چاندنی راتوں میں جب اُداس شیاما کسی پیڑ پر چہکتی ! ٹھاکر کا دل بھر آتا —— ! اُسے محسوس ہوتا جیسے شیاما اب بھی اسکے ساتھ بیٹھ

تلے کھیل رہی ہے ــــــ! ٹھاکر کی شیاما کی چہکار کس قدر رسیلی تھی ــــ! وہ اب تک نہیں بھولا اُس چہکار کو ــــ بھول کیونکر جاتا، شیاما اسکا جیون تھی، شیاما چلی گئی مگر اس کی یاد ٹھاکر کے دل میں موجود تھی ــــ! شیاما نے اُسے ــــ دُور کر دیا۔

وہ شیاما کو دل سے کیونکر دُور کرتا ــــ!

ٹھاکر واس لکھ رہا تھا۔ آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔!

ٹھاکر کے دُکھی جیون کے پانچسال اور بیت گئے ــــ!

ٹھاکر کے دل میں شیاما کی محبت بڑھتی جا رہی تھی ــــ!

ایک رات اُس نے دیکھا جیسے اس کی شیاما پیڑ تلے کھڑی ہے۔ اُسے بلا رہی ہے ــــ! وہ چونک کر اُٹھا۔ تیرہ و تار رات کس قدر بھیانک تھی، ہوا کے سرد جھونکے چل رہے تھے ــــ! شیاما مسکرا رہی تھی ــــ! ٹھاکر کو دیکھکر چونک سی گئی ــــ!

"شیاما میں ہوں ٹھاکر ــــ! بھول گئی ہو اُسے کیا؟"

وہ دوڑ کر آگے بڑھا ــــ مگر شیاما اور دُور ہو گئی ــــ! بہت دُور۔ وہ بھاگا، شیاما کے تعاقب میں! اُس نے دیکھا جیسے وہ ندی کے کنارے کھڑی ہے۔ اس نے سُنا تھا رات کو پریاں ندی کے کنارے ناچتی ہیں ــــ! شیاما بھی ایک پری تھی ــــ! اُس کے تصورات کی ندی گنگنا رہی تھی، وہ سمجھا شیاما گا رہی ہے۔ محبت کے گیت! وہ کنارے پر رُک گیا۔ شیاما

کے گیت کتنے سندر، اور من موہت تھے ——! وہ کھو گیا میٹھے اور رسیلے گیتوں کی لَے میں! ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس نے کھوئی ہوئی شیاما کو پا لیا ہے ——! وہ شیامو کے چرنوں میں جُھک گیا!

"شیاما اب میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑونگا ——!"

شیامو گا رہی تھی، وہ جھوم رہا تھا —— شیامو ناچ رہی تھی، وہ بیخود تھا ——!

وہ تمام رات پڑا رہا، شیامو کے چرنوں میں! علی الصباح لوگوں نے دیکھا! ٹھاکر ندی کے کنارے اکڑا ہوا پڑا تھا —— اوس اسکے پھٹے کپڑوں پر جم رہی تھی، وہ خاموش اور ٹھنڈا پڑا تھا —— اپنی شیامو کے آگے ——!

داس رُک گیا۔ افسانہ ختم ہو چکا تھا ——!

داس نے ایک انگڑائی لی —— چہرے پر مسرّت کی لہر دوڑ گئی۔ جیسے آج اس کا غم غلط ہو گیا تھا ——!

ایک ہفتہ کے بعد "چندن" کا تازہ پرچہ شیاما کے ہاتھوں میں تھا ——! وہ پڑھ رہی تھی نہایت انہماک کیساتھ! ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا کوئی بھولی بسری باتوں کو از سرِ نو تازہ کر رہا ہے —— جب اختتام پر پہنچی تو چیخ مار کر گر پڑی!

"کیا ہوا شیاما؟" ہریش دوڑ کر آئے۔

"کچھ نہیں" وہ بیٹھ گئی —— "ایک کہانی دیکھ رہی تھی —— اُف کس قدر دردناک تھی، میرا دل کانپ رہا ہے!"

"چھوڑو ان باتوں کو —— کہانیوں پر کون اعتبار کرتا ہے۔ یہ لوگ تو یوں ہی لکھ

ہیں" شیاما چونک پڑی — ! ہریش مسکراتے ہوئے چلے گئے — !

"کیا ٹھاکر کو سچ مچ شیاما سے محبت تھی — لکھنے والے نے جھوٹ تو نہیں لکھا !" وہ بولی پہلو میں دل دھڑک رہا تھا — ! اُسے یقین نہیں آتا — ! پیپل کا پیڑ شیاما اور ٹھاکر ہو بہو وہی باتیں — !" اُس نے ذہن پر زور ڈالا۔ واقعات ایک ایک کر کے آنکھوں کے آگے دوڑ رہے تھے — !

"ٹھاکر مر گیا ندی کے کنارے ؟ایشور ایسا نہ کرے — !" وہ تھر تھر کانپ رہی تھی ! تمام دن کھوئی ہوئی سی رہی — ! رات کو بھیانک خواب دیکھ رہی تھی — !

"شیاما ! ٹھاکر" کہتے ہوئے چونک پڑتی — !

اور داس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے شیاما کی محبت آج پہلے سے زیادہ اُسکے دل میں پیدا ہو گئی ہے — ! وہ چونک کر اُٹھا — !

سرما کی سرد تیرہ و تار رات تھی، وہ ندی کے کنارے کھڑا تھا۔ کان شیاما کے نغموں پر لگے ہوئے تھے — !

"شیاما پیاری" کہتے ہوئے جھک گیا — ! ہوا کے تیز جھونکے چل رہے تھے شیاما نے بے چینی سے کروٹ لیکر کہا — !

"ندی کنارے مر گیا شیاما کی یاد میں — !"

"کیا ہوا شیاما" ہریش کی آنکھ کھل گئی۔ چونک کر دیکھا، شیاما نیند میں بڑبڑا رہی تھی — !

"ٹھاکر مجھے معلوم نہ تھا کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے — ! مجھے معاف کر دو۔ ٹھاکر — !" شیاما چیخ مار کر پلنگ سے گر پڑی !

"شیاما پیاری شیاما!" ہریش نے جھنجھوڑ کر کہا ـــــ! شیاما کے قلب کی حرکت بند ہو چکی تھی ـــــ! ہریش دیوار سے ٹکرا کر گر پڑے ـــــ!

دو روز کے بعد اخبارات میں یہ افسوسناک خبر گشت لگا رہی تھی کہ "مشہور افسانہ نگار مسٹر داس گاؤں میں ایک ندی کے کنارے مُردہ پائے گئے! انکی موت کی وجہ اب تک معلوم نہیں ہو سکی۔ پولیس تحقیقات کر رہی ہے ـــــ!" ہریش کے ہاتھ سے پرچہ چھوٹ گیا ـــــ!

شراب و شباب

"مرکوزہ" کے سرخ جیل کے سیاسی قیدیوں نے
اپنے زمانۂ اسیری میں دیواروں پر جو کچھ لکھا
اسے "سُرخ جیل" کی تسخیر کے بعد ایک ادیب نے
نئی حکومت کی اجازت سے کتابی صورت
میں مرتب کیا۔ "شراب و شباب" اس کتاب کے
چند اوراق ہیں۔ (مرتب)

بارہ

جیل کی زندگی اپنے اندر سینکڑوں درس لئے ہوئے ہے۔ جیل ایک ایسا مقام ہے جہاں سماج اور قانون کے بسمل قدم قدم پر تڑپتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جیل کو اصلاحی ادارہ بنانے کی تمنا ایک بڑی حماقت ہے۔ جیل میں اسّی فیصدی اصلاح پسند مقید ہیں۔ قیدیوں کو اصلاحی تعلیم دینے سے کہیں زیادہ اس امر کی ضرورت ہے کہ معاشرت میں انقلاب پیدا کیا جائے قیدیوں کے رہا ہونے پر بھی سماج کے یہ ناگ انہیں کاٹنے دوڑتے ہیں۔ ان سیاہ سانپوں سے بچنے کے لئے انہیں دوبارہ

مفہوم سے نا آشنا ہو۔ ڈرو اس زمانہ سے جب تمہارے عناصر میں اعتدال باقی نہیں رہے گا۔ جب روحِ حیات تم سے چھین لی جائے گی۔ جب تمہارا شباب پیری میں منتقل ہو چکا ہو گا۔ اسوقت تم کفِ افسوس ملکر کہو گے "کاش ہم جوانی کی لذتوں سے لطف اندوز ہوتے"۔

قانون نے شباب کے لئے مسرتوں کے دروازے کھول رکھے ہیں۔ آؤ مستانہ وار ان دروازوں سے داخل ہو کر شراب و شباب کی نئی بستیاں آباد کریں قانون نے شباب کو سرمستی، کیف، شرابِ احمریں اور بہار دل کی آزادیاں دے رکھی ہیں طائرِ شباب کو ان بسیط فضاؤں میں اُڑنے دیں۔ شباب کی کشتیوں کو شراب کے سمندروں میں بہا دیں۔

فلسفہ عصیاں کے اس شاعرانہ اندازِ بیان کی تائید نوجوان نگاہیں کر رہی تھیں۔

میں ان نوجوانوں کی عقل و دانش پر ماتم کر رہا تھا۔ جو ایک گمراہ انسان کی باتوں کو بڑے غور سے سن رہے تھے۔

"کیوں صاحب! مجھے کچھ کہنے کی اجازت ہے کیا" میں نے کہا۔

"جی ہاں"۔ ایک نوجوان نے جواب دیا۔

"آپ بڑے شوق سے وعظ فرما سکتے ہیں"۔ دوسرے نے کہا۔

اجتماع کی خانگی حیثیت زائل ہو چکی تھی۔ اِدھر اُدھر سے لوگ بھی اکٹھے ہو گئے تھے۔

"حضرات! قانون نے شباب کو جن راستوں پر چلنے کی اجازت دے

جیل ہی میں جانا پڑتا ہے۔

میں ایک ایسے قیدی کو جانتا ہوں جو تئیس برس سے جیل میں سڑ رہا ہے میعاد ختم کرنے پر جب کبھی اس نے شہر کا رُخ کیا تو سماج نے چور چور کہکر اسکا سواگت کیا۔ وہ کام کرنے کے لئے نکلا تو اُسے چور سمجھکر کام پر نہ لگایا گیا۔ اس نے راہبانہ زندگی بسر کرنا چاہی لیکن مذہب کے اجارہ داروں نے اس کے "جرم" کو معاف نہ کیا سماج نے انتقام لینے کے لئے وہ ہر بار چوری کرتا اور جیل بھیجدیا جاتا۔

میں کس جرم کی پاداش میں یہاں مقید ہوں؟ میں نے ایک خود ساختہ اور عدو جمہور کے افکار کی علانیہ مخالفت کی، اور نتیجہ جانتے ہو ایک سال۔

میں ہر شام باغِ عامہ جانے کا عادی تھا۔ ایک شام میں نے مجسمہ کے قریب چند نوجوانوں کو دیکھا جو اپنی طرح کے ایک نوجوان کی باتوں کو بغور سن رہے تھے۔ پاس ہی کھڑے ہو کر میں نے اس کی باتوں کو سننا چاہا۔

"شباب ــــ شراب ہے اور شراب ــــ شباب، شباب نیکی ہے اور اس کی ہر حرکت کارِ ثواب، شباب اپنے سینہ میں بے بہا دولت چھپائے ہوئے ہے۔ کتنے نوجوان ہیں جو اس دولت کو فیاضی سے خرچ کرتے ہیں۔ بخیل کہیں کے۔ پیری شباب کے اس بخل کا انتقام ہے۔ شباب کی مسرتوں سے لطف اندوز نہ ہونا کتابِ آدمیت کا ایک المناک باب ہے۔ شباب کی کوئی گمنامی بدی کے نام سے نہیں پکاری جاتی۔ میرے نزدیک تم سب زندگی کے

رکھی ہے وہ راستے انتہائی بربادی پر ختم ہوتے ہیں۔ ہمیں قانون کی اس کمزوری سے فائدہ نہیں اُٹھانا چاہیے بلکہ اس قانون کو کتابِ آئین سے مٹانے کے لئے کوشش کرنی چاہیئے۔ یہ قانون ایک خوبصورت سانپ ہے جو شباب کی گردن میں لٹکا دیا گیا ہے۔ ایک جادو ہے ـــــ خونِ گرم کو آبِ سرد میں تبدیل کرنے کے لئے۔

اخلاق فروش حکومت سماج کی بہتری کے لئے کوئی قدم نہیں اُٹھا سکتی حکومت کو چاہیئے کہ شراب فروشی اور عصمت فروشی کے اڈوں کو قانوناً ناجائز قرار دے۔"

"حکومت کے میزانیہ میں کمی واقع ہونے کا احتمال ہے۔" سامعین میں سے کسی نے کہا۔

"میزانیہ کی اس کمی کو وزیروں کی تنخواہوں میں تخفیف سے پورا کیا جا سکتا ہے۔ جن شاہدانِ بازاری سے "لطف اندوز" ہونے کے لئے قانون کو آلہ کار بنا یا گیا۔ ان کی کیفیت کیا ہے؟ غازہ میں چھپی ہوئی مکروہ صورتیں! ان کے لبوں کی سرخی شباب کے خون سے ہے، ان کے رخسار فردوسِ شباب کے لئے جہنم کے انگارے ہیں! ان کا طرزِ تکلم مصنوعی، انکے الفاظ معنوں سے خالی۔

شباب ـــــ قانونی عشرتوں کے اس دروازہ سے داخل ہو کر عصائے پیری کو تھامے ہوئے دوسرے دروازہ سے باہر نکلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

آؤ! اس دروازہ کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیں!"

ان الفاظ کے ساتھ میں نے اس نوجوان کے افکار کی تردید کی۔ اگلے روز مجھ پر "قانون شکنی" کے جرم میں مقدمہ چلایا گیا۔ عدالت نے مجھے ایک سال قید کی سزا دی۔

اگر یہ قانون شکنی ہے تو قانون سازی کس بلا کا نام ہے؟

سپیرا

اختر شیرانی

وہ پرانے بھٹے کے ایک کونے میں اینٹوں کا ڈھیر لگا رہا تھا۔ اُس کا حقیقی نام کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔ بلکہ وہ آپ بھی مدتوں سے اسے بھول چکا تھا۔ اسکے یار دوست اسے "شیخ" کہکر پکارتے تھے۔ بنگال میں ہر ایک مسلمان کو اس نام سے پکارا جاسکتا ہے۔ چاہے وہ اس نام کے مطابق ہلکی سی بھی جسمانی یا ذہنی موزونیت نہ رکھتا ہو۔ دوسرے لوگ اسے لنگڑا کہہ کر یاد کرتے تھے۔ کیونکہ بچپن میں اسکا بایاں پیر ٹوٹ گیا تھا۔ اور اس نقص کی یادگار میں بیچارے کو تمام عمر کے لئے یہ خطاب حاصل ہو چکا تھا۔ یہی نہیں بلکہ چونکہ اسکی جوانی بے احتیاطی، اور بے پرواہی میں کٹی تھی۔ اسلئے اسے ایک گھناؤنی بیماری سے پالا پڑا۔ جس نے اس کی ناک کو بالکل غارت کر دیا اور اسکی جگہ ایک ڈراؤنا گڑھا یادگار چھوڑ گئی۔ اسکے بعد چیچک نکلی۔ اور چیچک کے گہرے داغوں نے اُسکی بدصورتی کو بالکل مکمل کر دیا۔

واحد بھٹے کی طرف اپنا چھکڑا لئے جا رہا تھا۔ اس نے اپنے بیلوں کو تیز چلانے کے لئے اُن کی دم مروڑی۔ اور ساتھ ہی ایک فحش سے گیت کی تان لگائی مگر یہ

جس تیزی سے پیدا ہوئی تھی۔ اسی تیزی سے غائب ہو گئی۔ بیل چلتے چلتے اچانک رُک گئے اور آنکھیں چڑھا کر اور نتھنے پُھلا کر زور زور سے سانس لینے لگے۔ بیلوں کے ایک دم رُکنے سے واحد اپنی جگہ سے آگے کی طرف لڑھکا اور بیلوں کو گالیاں دینے لگا۔ بیل کسی طرح آگے نہ بڑھے اور واحد نے اپنی پینی سنبھالی۔ وہ مارے غصّے کے پاگل ہو گیا تھا۔ پینی اُوپر اُٹھی۔ مگر اس سے پہلے کہ بیل کی کمر تک پہنچتی۔ وہ اپنی پوری طاقت سے چلّایا: "سانپ رے سانپ۔ شیخ او شیخ!!"

چھکڑے سے آگے چند گز کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا سانپ پھن اُٹھائے جھوم رہا تھا۔ واحد نے اپنے چھکڑے سے چھلانگ لگائی۔ اور دوڑ کر ایک اینٹ اُٹھالی۔

شیخ نے واحد کی آواز سنی تو تیزی سے لنگڑاتا ہوا اور ساتھ چلّاتا ہوا دوڑا "ارے ارے مارنا مت۔ مارنا مت! میں آتا ہوں"۔

واحد نے اٹھایا ہوا ہاتھ نیچے کر لیا۔ اور اینٹ مارنے سے رُک گیا۔

"اللہ کی قسم کیسا خوب صورت سانپ ہے"۔ واحد بولا۔ "اور دیکھنا شیخ منہ کتنا گہرے سُرخ رنگ کا ہے۔ اور پھن کتنا خوبصورت ہے۔ مگر یار جلدی کرو۔ بھاگ رہا ہے یہ تو"۔

سانپ نے خطرہ بھانپ لیا۔ اور واحد سے دُور بھاگنے لگا۔ اسے معلوم نہ تھا۔ کہ ایک اور دشمن اس کی تاک میں ہے۔ اور پاس آپہنچا ہے۔

"واحد ذرا اپنی پینی پھینکنا"۔ شیخ چلّایا۔ "او ہو بھٹے میں چلا گیا..... شیخ نے

غور سے بھٹے کے اندر دیکھنے لگے کہا۔ جہاں سانپ غائب ہوا تھا۔" اسے اودے ناگ کہتے ہیں، واحد جانتے ہو۔ اودے ناگ؟!"

پھر بولا۔ یہ کوبرے کی قسم کا ہوتا ہے۔ مگر بہت کم ملتا ہے۔ خدا کی قسم اگر یہ ہاتھ آگیا تو کچھ روپلے کما ہی لونگا۔"

شیخ عام سپیروں سے بڑا سپیرا تھا۔ کیونکہ وہ سانپوں کا علاج معالجہ کرنا بھی جانتا تھا۔ وہ اکثر اوقات اپنے گاؤں اور آس پاس کے دیہات میں اپنے سانپوں کی نمائش کرتا تھا۔ اور دیہاتی دلچسپی سے تماشا دیکھنے آتے تھے۔ وہ سانپوں کو مٹی کے گھڑوں میں رکھتا تھا۔ جن میں سے اکثر اسکی گھاس پھونس کی جھونپڑی کی چھت سے لٹکے رہتے تھے۔

جیسا کہ عام سپیروں کا قاعدہ ہے شیخ بھی اپنے دہشتناک قیدیوں میں سے بیماروں اور کمزوروں کو آزاد کر دیتا تھا۔ ان میں سے بعض قید کے صدمے سے مر بھی ضرور جاتے تھے۔ شیخ کا یہ تجارتی سرمایہ اسکی اچھی خاصی آمدنی کا ذریعہ تھا۔ اور جب تک اسکی یہ جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی پونجی پوری تعداد میں اسکے قبضے میں ہوتی وہ کھیتوں پر یا کھیتوں میں مزدوری کرنے نہ جاتا تھا۔

ایسی حالت میں وہ ایک ٹوکری میں اپنے سانپ ڈالے ہوئے۔ اور سپیروں کی تونبی منہ میں ڈالے پاس پڑوس کے دیہات میں نکلجاتا اور بہت کچھ کما لاتا۔ مگر اسکی یہ کمائی جلد ہی ختم ہو جاتی تھی۔ کیونکہ وہ بھنگ اور افیم کا عادی تھا۔ اور اس پر طرہ یہ کہ شراب کی چسکیاں بھی لگا لیتا تھا۔ اسکا نتیجہ ہمیشہ یہ ہوتا کہ جوں ہی شیخ کی جیب خالی ہوتی۔ وہ ایک پھاوڑا اور ٹوکرا لئے اپنے کھاتے پیتے پڑوسی کسانوں کے

دروازوں پر نظر آتا اور پوچھتا "کوئی مزدوری؟ کوئی کام؟" ایسے لوگوں کے سامنے وہ بڑی لجاجت سے مسکراتا۔ اور اسکی مسکراہٹ سے اسکے بدنما چہرے پر جو شکنیں پڑتیں وہ چہرے اور زیادہ بدنما اور ہیبت ناک بنا دیتیں۔ شیخ میں یہ بات ضرور تھی کہ وہ اپنے اس قسم کے گاہکوں کو کبھی دھوکا نہ دیتا۔ اسے کیسا ہی سخت کام ملتا وہ بڑی محنت اور دیانت داری سے اسے انجام دیتا۔ جس دن اسے کوئی کام نہ ملتا وہ بھیک مانگنے نکل جاتا۔ بھیک مانگنا۔ مزدوری کرنا اور سانپوں کا تماشہ دکھانا اسکے لئے سب یکساں کام تھے۔ یہ تھوڑی بہت خیرات بھی جو اسے ملتی حسب معمول اسکے نشے پانی پر خرچ ہوتی تھی۔ کبھی کبھی وہ کچّی شراب پی آتا۔ اور جھومتا جھامتا گھر لوٹتا ایسی بدمستی کی حالت میں وہ اپنی گھر والی کے پاؤں پکڑ لیتا اور شرابیوں کی طرح آنسو بہاتا ہوا کہتا "میں نے تمہیں بڑے دُکھ پہنچائے ہیں زبیدہ میں نے تمہیں فاقوں مار دیا ہے۔"

زبیدہ ہنس دیتی اور اپنے پیر چھڑاتے ہوئے کہتی "چھیڑ خانی کی باتیں نہ کرو۔ مجھے چھوڑ دو۔ تمہارے کھانے پینے کے لئے کچھ لاتی ہوں۔"

اس پر شیخ دھاڑیں مار مار کر رو دیتا اور کہتا "ہائے میں نے تمہارے لئے کبھی نئے کپڑے بھی تو نہیں بنوائے۔"

(۲)

دوسرے دن صبح پو پھٹتے ہی شیخ بھٹے پر پہنچا۔ ایک چھوٹی سی قمچی، اور سرکنڈوں کا بنا ہوا صندوق اسکے ہات میں تھا۔ مشرق کی طرف آسمان پر ایک گہری سُرخ روشنی کا طوفان منڈلا رہا تھا۔ گنجان درختوں پر چڑیوں کے جھنڈ سہانے گیت گا رہے تھے

دور کسی مندر سے صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی اور دھیمی دھیمی ہوا کے جھونکے گھنٹیوں اور سنکھوں کی آوازیں لئے آرہے تھے۔

شیخ مٹی کے ڈھیر پر بیٹھ گیا اور غور سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ شفق کی سرخی دم بدم پھیلتی جا رہی تھی۔ اسکا بڑھتا ہوا رنگ اینٹوں کو بہت زیادہ سرخ بنا رہا تھا یہاں تک کہ شیخ کے میلے کچیلے کپڑوں پر بھی رنگت آگئی تھی۔ یک بیک اس نے کچھ دیکھا۔ "اور یہ رہا وہ" کہکر جلدی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

کچھ فاصلے پر کھُلی جگہ میں۔ کل والا سانپ آسمان کی سُرخی کی طرف اپنا پھن پھیلائے خوشی سے جھوم رہا تھا۔ سورج کی ابتدائی کرنوں کا اسکے ننھے سے لمبے بدن پر عکس پڑ رہا تھا اور اسکے سرخ رنگ کو شوخ اور خوش نما بنا رہا تھا سرخ رنگت کے ساتھ اس کے پھن کی سیاہ دھاریاں رنگوں کے امتزاج کا بہت ہی سہانا سماں دکھا رہی تھیں۔ وہ اس وقت اتنا ہی خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ تتلی۔ جس کے سرخ بازوؤں پر پتلی پتلی سیاہ لکیریں ہوں۔

سپیرا بھی اسکی خوش نمائی سے بہت متاثر ہوا۔ اور ہونٹوں ہی ہونٹوں میں "واہ" کہنے پر مجبور ہو گیا۔ اب وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ سانپ سورج کی کرنوں سے کچھ اس دھن میں کھیل رہا تھا کہ اسے دشمن کے آنے کی خبر تک نہ ہوئی۔ نہ اسکے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ بدستور اپنی دھن میں مگن تھا۔ مگر جب شیخ بالکل ہی قریب جا پہنچا۔ تو اس نے بجلی کی سی تیزی سے اپنا پھن گھمایا۔ اور پھنکار ماری۔ مگر شیخ کے ماہر ہاتھوں نے سانپ سے بھی زیادہ تیزی کیساتھ

قچی سے اس کے پھن کو دبایا اور زمین سے ملا دیا۔ اب اس نے سانپ کی دم پکڑ لی۔ اور اُسے ڈرانے اور ستانے کے لئے دو تین جھٹکے دیئے۔ اسکے بعد اس نے اپنے قیدی کو اچھی طرح دیکھا بھالا اور بڑبڑایا "یہ تو ناگن ہے"۔

(۳)

چھ ماہ گزر چکے تھے۔ ایک دن دوپہر کے وقت شیخ چلم پی کر اپنی بیوی کے پاس آیا۔ اور بولا "دیکھو بیوی میں کیا چیز لایا ہوں"؟

زبیدہ نے جو صحن کے اس کنارے کھڑی تھی۔ منہ پھیر کر پوچھا "کیا چیز ہے"؟

میاں نے اپنے کپڑوں کی تہ میں سے ایک چھوٹا اور مہین سا چھلّا نکالا۔ اور اسے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ لیا جب بیوی قریب پہنچی تو بولا "دیکھو"!

اسکی ہتھیلی پر ایک ننھی سی ننھی رکھی تھی۔ زبیدہ اسے دیکھ کر بولی:-

"اتنی چھوٹی سی ننھی کا کیا ہوگا۔ میری ناک میں تو یہ نہیں آنے کی"!

شیخ نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے کہا "اری یہ تو چھوٹی بی بی کیلئے لایا ہوں"۔

شیخ نے ناگن کا نام "بی بی" رکھا تھا۔ زبیدہ نے حیران ہو کر اپنے میاں کی طرف دیکھا۔

شیخ ہنستا ہوا کوٹھڑی میں چلا گیا۔ اور فوراً ہی ناگن کو اپنے گلے سے لپٹائے ہوئے باہر آ گیا۔ یہ وہی ناگن تھی۔ جسے اس نے بھٹے سے پکڑا تھا۔ پچھلے چند ماہ میں وہ کافی بڑی ہو گئی تھی۔ بلکہ اسکی وحشت اور دشمنی کی عادتیں بھی چھوٹ گئی تھیں۔ قیدنے اس کا جوش ہزوش مٹا دیا تھا۔ اس نے اپنا چھوٹا سا چوڑا پھن اُٹھایا۔ اور بڑے چاؤ پیار سے شیخ کی گردن اور کندھوں کے اِدھر اُدھر لہرانے لگی

یہ دیکھکر شیخ کی بیوی بے چینی سے بولی "ایسا نہ کرو۔ مانا کہ تم نے اسے سدھا لیا ہے مگر موذی جانور کا کیا بھروسہ ہے؟"

"بھروسہ تو صرف زہریلے دانتوں کا نہیں ہوتا زبیدہ۔" شیخ نے اپنی بیوی کو تسلی دینے کے خیال سے کہا۔ "مگر یہ محبّت بھی تو کرنا جانتے ہیں۔ ٹھیک ہے یا نہیں؟ اور "بی بی" کے زہریلے دانت ہیں ہی نہیں۔ ویسے دانت ضرور ہیں۔ مگر کیا اس نے آج تک مجھے کاٹا؟ دیکھو کیسی میرے گلے سے لگی ہے۔ جیسے کوئی چاہنے والی عورت ہو۔"

اس نے پیار سے اپنی انگلیوں کے ساتھ ناگن کا منہ بند کیا۔ اور اسے چوما۔ یہ زبیدہ کے لئے کوئی نئی بات نہ تھی۔ وہ پہلے بھی بیسیوں مرتبہ اسے ایسا کرتے دیکھ چکی تھی۔ اور اس سے اُس کے دل کو بڑا دُکھ پہنچتا تھا۔

اس نے کسی قدر تیزی سے کہا۔ "میں نے کتنی دفعہ تمہیں سمجھایا ہے کہ اس کا منہ نہ چوما کرو۔ مگر تم ایک نہیں سنتے۔ غضب خدا کا۔ کوئی ایسے گندے کیڑے کا منہ بھی چومتا ہے۔"

شیخ زبیدہ کی بات سنی ان سنی کر کے بولا۔ "دیکھنا زبیدہ بی بی میرے کندھے کے ساتھ کس پیار سے لپٹی ہوئی ہے۔ جب یہ سانپ بڑے پیار سے آپس میں لپٹے ہوتے ہیں۔ اس وقت بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ تم نے بھی کبھی اُن کا یہ پیار کا کھیل دیکھا ہے؟"

اس پر زبیدہ بہت ناراض ہوئی۔ اس نے اپنا منہ ایک طرف پھیر لیا اور بولی "یہ لپٹنے چپٹنے کی کہانی تو سناؤ کسی اور کو۔ پر میں اتنا کہے دیتی ہوں کہ تمہاری موت

ان ہی سانپوں کے کاٹے سے ہو گی۔ یہ تمہارا ہی پیار کا کھیل ختم کر کے نہ رکھ دیں تو میرا نام زبیدہ ...."

اور زبیدہ نے منہ جو پھیرا تو کیا دیکھتی ہے۔ کہ شیخ سوئی لئے "بی بی" کے نتھنے چھید رہا ہے۔ اس نے "بی بی" کو چھوڑ دیا۔

ناگن آزاد ہوتے ہی تڑپ کے کنڈلی کی صورت بن گئی، اس نے مارے درد اور غصے کے زور سے پھنکار ماری اور دُم کے سہارے کھڑی ہو کر شیخ کو کاٹنے کے لئے وار پر وار کرنے لگی۔ شیخ نے اسکے خوں آشام دانتوں کے حملوں سے بچنے کے لئے بی بی والے صندوق کے ڈھکنے کو آڑ بنا لیا۔ جو بی بی کے زوردار حملوں سے لرزلرز اٹھتا تھا۔

"بی بی! میری پیاری، اتنی خفا مت ہو!" اُس نے چمکارتے ہوئے کہا "خفا مت ہو۔ تم یہ نتھنی پہنکر بہت اچھی لگتی ہو"۔ (زبیدہ سے مخاطب ہو کر) "زبیدہ ذرا دینا تو آئینہ۔ ذرا بی بی کو بھی تو معلوم ہو کہ وہ کیسی خوبصورت معلوم ہوتی ہے"

غصے سے جلی بھُنی زبیدہ بولی: "میں نہیں دیتی آئینہ وائینہ ......"

"لا بھی دو ذرا۔ ہم بھی تو دیکھیں۔ بی بی اپنی شکل آپ دیکھکر کیا کرتی ہے۔

زبیدہ چارو ناچار۔ آئینہ لانے کے لئے۔ دوسری کوٹھڑی میں گئی۔

"اور ہاں ذرا سا سیندور بھی لیتی آنا" شیخ نے چلّا کر کہا۔

جواب میں کوٹھڑی کے اندر سے کسی کی حیرت بھری آواز آئی: "سیندور کا کیا ہو گا؟"

"یہ ابھی نہیں بتاؤں گا" اسکے شوہر نے قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا۔"

"تھوڑی دیر ٹھہرو۔ دیکھو میں کیا کرتا ہوں"!

زبیدہ نے آئینہ اور سیندور کا پیالہ لاکر دور ہی سے اپنے شوہر کے قریب سرکا دیا۔

شیخ نے چالاکی سے دوبارہ ناگن کو پکڑ لیا۔ اور اسکے پھن پر چھوٹا سا تلک لگا دیا۔ جیسے ہندو لوگ شادی بیاہ کے موقعے پر دولھا دلہن کے ماتھے پہ لگا دیا کرتے ہیں۔ تلک لگا چکنے پر اس نے بڑے زور سے قہقہہ مارا اور بولا:۔

"دیکھو زبیدہ! اب میں اور یہ میاں بیوی ہیں"! میں نے اس سے بیاہ کر لیا ہے۔ آج سے "بی بی" میری دوسری بیوی بن گئی ہے۔

زبیدہ گونگی بنی ہوئی کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

"بی بی! پیاری تم کیسی سندر دکھائی دیتی ہو"! اس نے آئینہ اٹھا کر اپنی "نئی بیوی" کے سامنے کیا۔ اور "بی بی" کے صندوق پر بانہہ رکھ دی اور اپنے پھٹے ہوئے ڈھول کے گلے سے بھرائی ہوئی آواز میں گانے لگا ——!

(۴)

چند ماہ بعد کا ذکر ہے۔ برسات کا موسم تھا۔ آسمان سے ایک لگاتار طوفان برس رہا تھا۔ شیخ کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ چونکہ ارد گرد کے دیہات میں سیلاب آیا ہوا تھا۔ اسلئے وہ گھر نہیں لوٹ سکتا تھا۔ زبیدہ نے ایک دن اپنی کوٹھڑی میں ایک انوکھی سی خوشبو محسوس کی۔ خوشبو نہ جانے کس چیز کی تھی۔ اور نہ جانے کدھر سے آ رہی تھی۔ مگر تھی بہت سہانی۔ اس سے پہلے کبھی اس نے اس قسم کی خوشبو نہیں سونگھی تھی۔ اس نے یہ معلوم کرنے کی بہت کوشش کی کہ خوشبو کہاں سے آ رہی ہے

مگر بے سود۔ کئی دن تک یہ اسکے لئے معمّا بنی رہی۔

ایک ہفتے بعد شیخ گھر لوٹا۔ اس نے جی بھر کر برسات کو کوسا جس نے اسے گھر سے دُور رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"میرا تو مارے بھوک کے دم نکل رہا ہے"۔ اس نے ایک ہی وقت میں اپنے سانس اور بد دعاؤں کے ذخیرے کو ختم کرتے ہوئے کہا۔ "جلدی کر و بیوی، کچھ کھانے کو دو"۔

اس نے اپنے پیروں اور پنڈلیوں سے کیچڑ صاف کیا۔ اور اسکی بیوی نے باسی چاول لاکر سامنے رکھ دیئے۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ چاول کھانے کے لئے پالتی مار کے بیٹھے اس نے دریافت کیا۔

"یہ خوشبو کیسی ہے بیوی؟"

"اللہ ہی جانے"۔ اس کی بیوی نے جواب دیا۔ "میں آپ کچھ دن سے حیران ہو رہی ہوں۔ اتنا تو پتہ ہے کہ یہ خوشبو اسی کوٹھڑی میں آتی ہے۔ باہر کہیں نہیں آتی"۔

شیخ کچھ نہ بولا۔ اور سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر منہ کر کے زور زور سے سونگھنا شروع کر دیا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ خوشبو کیسی ہے۔ اور کہاں سے آتی ہے۔

کوٹھڑی میں اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے یکایک "بی بی" کے صندوق کے پاس رک گیا۔ ناگن نے اسکے قدموں کی آہٹ سُنکر پھُنکار ماری۔

"اچھا......!" شیخ کے منہ سے نکلا۔

"کیا بات ہے؟" زبیدہ نے فکر مندی سے دریافت کیا۔

"یہ خوشبو "بی بی" کے بدن سے نکلتی ہے!"

شیخ نے سنجیدہ منہ بنائے ہوئے جواب دیا۔

"بی بی مادہ ہے۔ اور کسی نر کے لئے بے چین ہے۔ یہ اسکے گرمانے کا موسم ہے۔ زبیدہ۔ اور جب کوئی ناگن گرماتی ہے تو ہرن کی کستوری کی طرح اسکے بدن سے خوشبو نکلتی ہے۔ یہ خوشبو ایک طرح کی پکار یا آواز ہے کسی نر کو بلانے کے لئے!"

زبیدہ کا منہ کھلا کا کھلا اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ باتیں اسکے لئے حیران کن بلکہ پریشان کن ہیں۔ آخر وہ بولی:۔

"تو آؤ اب چاول کھالو۔ مجھے ان باتوں سے کیا مطلب؟"

"بی بی کو چھوڑے دیتا ہوں میں!" شیخ نے چاول کھاتے ہوئے جواب دیا۔ "اس حال میں اسے بند رکھنا بڑا ہی پاپ ہوگا!" اس کی بات ایک ٹھنڈے سانس پر ختم ہوئی۔

زبیدہ نے بھی ایک لمبا سانس لیا۔ مگر یہ سانس اطمینان کا تھا۔ کہنے لگی "ہاں اسکا چلا جانا ہی اچھا ہے۔ مجھے یہ گھنونے کیڑے اچھے نہیں لگتے!"

شیخ چاول کھا چکا تو اس نے "بی بی" کو صندوق سے باہر نکالا۔ اور اپنی انگلیوں سے اسکا پھن پکڑ کر چمکارنے لگا۔

دفعتاً زبیدہ کو یاد آیا کہ مدت سے ناگن کے زہریلے(۱) دانت نہیں نکالے گئے۔ اور اب پھر وہ بڑھ گئے ہونگے۔ وہ گھبرا کر کہنے لگی "جلدی کرو۔ اسے جانے دو۔ میں کہتی ہوں۔ اب رکو مت۔ چھوڑ دو جلدی سے!"

(۱) زہریلے سانپوں کو پالنے والے ان کے دانتوں کو باقاعدہ توڑتے رہتے ہیں

"بی بی کو مجھ سے پیار ہو گیا ہے۔ دیکھو کس چاؤ سے وہ میرے کندھے سے لگی ہوئی ہے"۔

شیخ نے ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے کہا۔

سانپوں کا لنگڑا حکیم اپنے جھونپڑے کے ایک اندھیرے کونے میں غمگین بیٹھا تھا وہ "بی بی" کو قریب کے جنگلوں میں چھوڑ آیا تھا۔ زبیدہ نے اسے غور سے دیکھا اور ہمدردی سے بولی "اداس کیوں بیٹھے ہو واں۔ تمانکو پی لو نا۔ بالیبٹ ہی رہو۔

شیخ نے گھٹنوں سے سر اٹھایا اور جواب دیا "اس کے نہ ہونے نے مجھے بڑا دکھ پہنچایا ہے زبیدہ"۔

"اللہ اللہ کرو"۔ زبیدہ ہنس کر بولی۔

کیا وہ کوئی عورت تھی؟ بولتے کیوں نہیں عورت تھی کیا وہ؟!

"نہیں بیوی۔ مگر مجھے پھر بھی صدمہ ہے"۔

زبیدہ اپنے میاں کے پاس بیٹھ گئی۔ اور اپنے بازو اسکے گلے میں ڈالکر پیار سے بولی "کیوں جی کیا تمہیں مجھ سے پیار نہیں؟"

شیخ نے اس کے گال پر منہ رکھتے ہوئے جواب دیا۔ "تم تو اپنے جیون کا چین ہو"۔

یک بیک زبیدہ کا بدن کانپ اٹھا اور وہ چلائی "دیکھو بی بی آگئی، بی بی پلٹ کر آگئی۔ وہ دیکھو۔ وہ موری کے اندر"!

ناگن سچ مچ دیوار کے پاس موری کے ادھر ادھر گھوم رہی تھی۔

"میں اسے پکڑتا ہوں"۔ شیخ نے کھڑے ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ مگر زبیدہ نے اپنی پوری طاقت سے اسے پھر بٹھا دیا۔ اور چلائی "نہیں نہیں"!

پھر اس نے غصے سے سانپ کی طرف رُخ کر کے کہا: "چلی جا یہاں سے گندی کہیں کی۔" وہ انتہائی غصّے سے کھڑی ہوئی اور ایک چھوٹا سا پتھر اٹھا کر زور سے ناگن کے مارا۔ یہ چوٹ ناگن کے انتہائی غیظ و غضب کا باعث ہوئی اور وہ فوراً اچھل کر بار بار زمین پر پھن مارنے اور کلٹنے لگی۔ پھر آہستہ آہستہ موری میں واپس چلی گئی۔

اسی دن آدھی رات کو زبیدہ نے اپنے سوئے ہوئے شوہر کو جھنجھوڑ کر اٹھایا اور بڑی وحشت کے ساتھ کانپتی ہوئی چیخ مار کر بولی: "اٹھو ہائے اٹھو! مجھے کسی چیز نے کاٹ لیا ہے۔"

شیخ نے جلدی سے چراغ جلایا۔ زبیدہ کے دائیں بازو پر ایک چھوٹا سا خون کا قطرہ روشنی میں چمک رہا تھا۔

"بی بی" تمہاری پیاری "بی بی" نے مجھے کاٹا ہے۔" زبیدہ دوبارہ چلائی: "وہ دیکھو وہ رہی چھنال، حرام زادی!"

زبیدہ کے مرنے کے بعد شیخ نے اپنا گھر چھوڑ دیا اور دور ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنا کر رہنے لگا۔ اس کا پرانا گھر اب سانپوں کا مسکن تھا۔ جو سب کے سب اودے ناگ قبیلے کے سانپ تھے۔

یا بالفاظ دیگر بی بی اور اسکی اولاد نے اس گھر پر قبضہ کر لیا تھا۔

ہر روز سورج کے طلوع ہونے پر اس کی زرد، زرد ناچتی ہوئی شعاعوں کے ساتھ اس گھر میں بیسیوں چھوٹے بڑے قرمزی رنگ کے سانپ جھومتے اور لہراتے نظر آتے تھے ——!

بات یہ تھی شیخ نے زبیدہ کا انتقام لینے کے لئے "بی بی" کو مارا نہیں اور عرق یہ کہکر چھوڑ دیا:۔

" میں تمہیں الزام نہیں دیتا " بی بی "! اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ـــــ عورت ذات میں حسد کا مادہ بہت زیادہ ہوتا ہے ـــــ اور سوتیا ڈاہ تو مشہور ہے۔ زبیدہ تم سے جلتی تھی۔ پھر تم کیوں نہ اس سے جلتیں؟ سوکن کس کو پیاری لگتی ہے ـــــ "

غالب اور گوئٹے

حاجی لق لق

مجھ سے روائت کیا مرزا بٹیہ باری علیگ نے اور انہوں نے سنا اپنے دوست مرزا کاظم سے اور مرزا کاظم نے سنائی آپ بیتی میرے الفاظ میں۔ اور اسکا ثواب پہنچا ہے۔ غالب اور گوئٹے کی ارواح کو اور دعا کیجئے میرے حق میں۔ اور واللہ اعلم بالصواب!

مرزا کاظم جن دنوں برلن میں تھے۔ ان ایام کا ذکر ہے۔ کہ مرزا صاحب کی ملاقات ایک پنجابی سکھ پریتم سنگھ سے ہوئی۔ اور دونوں چار روز تک ایک قہوہ خانہ میں ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ ایک روز سردار جی نے مرزا صاحب سے کہا۔ کہ بھائی صاحب! بات یہ ہے۔ کہ میں اٹلی جانا چاہتا ہوں۔ اور میرے پاس پیسہ کوئی نہیں۔ اٹلی میں میرا مستقبل بہت شاندار ہو سکتا ہے۔ اسلئے اگر آپ کچھ روپیہ بطور قرض مجھے دے دیں۔ یا کسی دوست سے دلا دیں۔ تو میں اٹلی پہنچکر تھوڑے ہی عرصہ میں قرض چکا دونگا۔

مرزا کاظم نے ایک لمحہ بھر سوچنے کے بعد کہا۔ قرض؟ سردار صاحب! یہاں پردیس میں کون ایسا ہندوستانی فارغ البال ہو سکتا ہے۔ جو اپنے اللے تللوں

کے علاوہ کسی دوست کو قرض دے سکے۔

سردار جی۔ مجھے کچھ زیادہ روپیہ نہیں چاہیئے۔ صرف ۔۔۔۔۔۔

مرزا صاحب۔ (بات کاٹ کر) اجی کم زیادہ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بات یہ ہے۔ کہ کسی سے ایسی درخواست کرنا ہی بے معنی چیز ہے۔

سردار جی۔ (مایوسی کے لہجہ میں) تو پھر کیا کیا جائے؟

مرزا صاحب۔ کیا کیا جائے؟ بہت کچھ ہو سکتا ہے۔

سردار جی۔ (پُرامید نگاہوں سے دیکھتے ہوئے) وہ کیا۔ وہ کیا؟

مرزا صاحب۔ وہ یہ کہ ہندوستانیوں کی بجائے جرمنوں سے روپیہ حاصل کیا جائے۔ وہ بہت آسان کام ہے۔

سردار جی۔ وہ کیسے؟

مرزا صاحب۔ میں کل بتاؤنگا۔ آپ اسی وقت یہاں تشریف لے آئیے۔

سردار جی کی آنکھیں ان الفاظ کو سنکر چمک اٹھیں۔ اور آپ مرزا صاحب کا پیشگی شکریہ ادا کر کے رخصت ہوئے۔

رات بھر سردار جی کو نیند نہ آئی۔ اور دوسرے دن وقت مقررہ سے پہلے ہی قہوہ خانہ میں پہنچ گئے۔ اور بے صبری کیساتھ مرزا کاظم کا انتظار کرنے لگے۔ آخر مرزا آئے۔ اور چائے کی پیالی پیتے ہوئے یوں گویا ہوئے۔

مرزا صاحب۔ دیکھئے سردار جی! مرزا غالب ہندوستان کے بہت بڑے شاعر تھے۔ آپ جانتے ہی ہونگے۔

سردار جی۔ وہی نا جنہیں انڈین شیکسپیئر کہتے ہیں؟

مرزا صاحب۔ (مسکراتے ہوئے) نہیں، نہیں انڈین شیکسپیئر تو آغا حشر کاشمیری تھے۔ جو مشہور ڈرامہ نویس تھے۔ غالب ان سے بہت پہلے عہدِ مغلیہ میں گذرے ہیں۔ آپ کا نام اسد اللہ خاں تھا۔ اور وطن دہلی، آپ فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے بہت بڑے شاعر تھے۔ لیکن عمر تنگدستی میں گذری۔ آپ کو شراب نوشی کا بہت شوق تھا۔ اسلئے کبھی فارغ البالی نصیب نہ ہوئی۔

سردار جی۔ میرے چچا ہرنام سنگھ کی طرح، ذیلدار تھا، دو سو بیگھہ زمین تھی۔ ضلع بھر میں عزت تھی۔ لیکن شراب نے بیڑا غرق کر دیا۔ آج اسے کوئی دس روپے اُدھار نہیں دیتا۔

مرزا صاحب۔ ہاں، ہاں، بس غالب کی بھی یہی حالت تھی، لیکن تھا بڑا خود دار مرتا مر گیا، لیکن اُمرا کے سامنے نہ جُھکا۔ اسکی ایک خوبی یہ تھی۔ کہ......

سردار جی سر تو ہلاتے جاتے تھے، لیکن دل میں سوچتے تھے۔ کہ بات تو جرمنوں سے روپیہ حاصل کرنے کی تھی۔ یہ مرزا صاحب غالب کا قصّہ کیوں چھیڑ بیٹھے آپ کچھ کہنا ہی چاہتے تھے۔ کہ مرزا کاظم نے انکے دل کی بات کو بھانپ کر ہاتھ سے اشارہ کیا۔ جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ خاموشی سے سنتے جائیے۔

مرزا صاحب۔ غالب ایک فلاسفر شاعر تھے۔ اور انہوں نے وہی زمانہ پایا۔ جو جرمنی کے شاعر گوئٹے کو نصیب ہوا۔ گوئٹے بھی......

مرزا صاحب یہاں تک کہہ پائے تھے۔ کہ سردار جی سے صبر نہ ہو سکا۔ اور انہوں نے بات کاٹ کر اپنی بات شروع کر دی۔

سردار جی۔ لیکن مرزا صاحب! جہنم میں جائیں غالب اور گوئٹے! آپ نے وعدہ کیا

تھا کہ آپ جرمنوں سے روپیہ حاصل کرنے کی ترکیب بتائیں گے۔

مرزا صاحب۔ بالکل درست، اور میں وہی ترکیب تو بتا رہا ہوں۔ آپ ذرا سنتے جائیے۔ آپ ہندوستان کے بہت بڑے مؤرّخ، ادیب اور شاعر ہیں۔

سردار جی۔ میں اور شاعر؟

مرزا صاحب۔ بس آپ چُپ رہیئے۔ اور میری بات سنئے۔ آپ اتوار کے دن "ہومبرگ ہال" میں ایک تقریر کریں گے۔ جس میں آپ غالب اور گوئٹے کی شاعری کا موازنہ کریں گے۔

سردار جی۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ میں تو جرمن زبان کا ایک لفظ بھی نہیں جانتا اور نہ غالب اور گوئٹے کی شاعری سے واقف ہوں۔

مرزا صاحب۔ آپ اُردو زبان میں اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے۔ تو پنجابی زبان میں تقریر فرمائیے۔ بات صرف یہ ہے۔ کہ بولتے جائیے۔ غالب اور گوئٹے کی شاعری سے آپ واقف نہیں۔ تو اُنکے نام تو چنداں مشکل نہیں۔ ذرا کہئے تو

سردار جی۔ غالب گوئٹے، غالب گوئٹے۔

مرزا صاحب۔ بالکل ٹھیک، آپ پاس ہو گئے۔ صرف اتنی بات ہے، کہ غالب انڈ گوئٹے کہئے۔ انگریزی زبان میں جسے ہم اینڈ کہتے ہیں۔ جرمن میں اسے انڈ کہا جاتا ہے۔

سردار جی۔ غالب انڈ گوئٹے، غالب انڈ گوئٹے۔

مرزا صاحب۔ واہ، واہ خوب، اب آپ ہندوستان کے بہت بڑے سکالر ہیں۔ کل برلن کے اخبارات میں اعلان شائع ہو گا۔ کہ ہندوستان کے مشہور سکالر

سردار پریتم سنگھ اتوار کے دن بوقتِ شام ہومبرگ ہال میں "غالب اور گوئٹے" کے موضوع پر ایک زبردست تقریر کریں گے۔ داخلہ ٹکٹ کے ذریعے ہوگا۔ وغیرہ۔

سردار جی۔ لیکن میں تقریر میں کہوں گا کیا؟

مرزا صاحب۔ جو جی میں آئے کہتے جائیے۔

اتوار کی شام آ پہنچی۔ ہومبرگ ہال جرمن "اہلِ ذوق" سے کھچا کھچ بھر گیا۔ صدارت کی کرسی پر برلن کے مشہور ماہرِ ادبیات جلوہ افروز تھے۔ انکے ایک طرف سردار پریتم سنگھ اور دوسری طرف مرزا کاظم بیٹھے تھے۔ تقریر کا وقت آ گیا۔ اور سردار صاحب تقریر کرنے کے لئے اُٹھے۔ صاحب صدر نے اُٹھکر حاضرین سے پروفیسر پریتم سنگھ کا تعارف کرایا۔ جس پر ہال خیر مقدم کی تالیوں سے گونج اُٹھا۔

سردار صاحب نے اپنی تقریر شروع کی۔

صاحبان! مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلی کے رہنے والے تھے۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں کے شاعر تھے۔ شراب بہت پیتے تھے۔ اسلئے انکی عمر تنگدستی میں گزری۔ دہلی ہندوستان کا دار السلطنت ہے۔ وہاں ایک گھنٹہ گھر بھی ہے چاندنی چوک میں سودا بیچنے والوں کی صدائیں بہت پیاری ہوتی ہیں۔ ہر طرف آوازیں آتی ہیں "غالب انڈ گوئٹے"!

مجمع نے پُرزور تالیاں آسمان سر پر اُٹھا لیا اور جب تالیوں کی گونج ختم ہوئی تو سردار صاحب نے تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

دہلی سے تین سو میل کے فاصلے پر لاہور ہے۔ میں ضلع لاہور کا رہنے والا ہوں

ہمارا علاقہ بڑا زرخیز ہے۔ پچھلے سال بارشیں کم ہوئی تھیں۔ اسلئے فصلیں اچھی ہوئیں۔ اس سال گورومہاراج کی کرپا ہے۔ نہر میں بھی پانی خوب رہا۔ اور بارشیں بھی اچھی ہو گئیں۔ اُمید ہے کہ گیہوں کی فصل اچھی رہے گی۔ لاہور کی بہت چیزیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ مثلاً بادشاہی مسجد، مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھ، چڑیا گھر، عجائب گھر غالب انڈ گوٹے۔

پھر تالیوں سے فضا گونج اُٹھی۔ اور صاحب صدر کے لبوں پر تبسّم رقص کرنے لگا۔ آپنے میز پر ہاتھ مار مار کر مقرر کی "جادو بیانی" کی داد دی۔ سردار صاحب نے اپنی حوصلہ افزائی ہوتی دیکھی۔ تو ذرا بلند آواز سے تقریر کرنے لگے۔ فرمایا۔ غالب انڈ گوٹے کی بد قسمتی تھی۔ کہ انہوں نے شری دربار صاحب امرتسر کے درشن نہ کئے۔ حتیٰ کہ وہ ضلع گورداسپور بھی نہ جا سکے۔ ورنہ وہاں کا گڑ کھا کر انہیں نانی سپنے میں یاد آجاتی۔ ضلع امرتسر میں ایک گاؤں چمیاری ہے وہاں کے خربوزے بہت مشہور ہیں۔ قصور کی میتھی بہت مشہور ہے۔ اور پھر غالب انڈ گوٹے کے کیا ہی کہنے ہیں۔ گویا انڈیا انڈ جرمنی۔

اس دفعہ سردار نے استاد کے بتائے ہوئے سبق "غالب انڈ گوٹے" پر "انڈیا انڈ جرمنی" کا اضافہ کر کے کمال ہی کر دیا۔ اور ان الفاظ نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ تالیوں سے ہال گونج اُٹھا۔ سردار صاحب نے تقریر جاری رکھی۔ اور تین فقرے کہنے کے بعد فرمایا۔ کہ صاحبان اب غالب کے اشعار بھی سنئے۔

اس مقام پر اُٹھ کر مرزا کاظم نے حاضرین سے جرمن زبان میں کہا کہ پروفیسر پریتم سنگھ اب غالب کے چند اشعار سنائیں گے۔ سردار صاحب نے اپنی مخصوص لے میں

یہ گانا شروع کر دیا ہے

اساں نت دے شرابی رہناں نی ہرام کوڑے نارے

ادھ وچ کنارے کرکے

مرزا کاظم کرسی سے اُچھل پڑے۔ جس پر سامعین نے تالیوں سے فضا میں گونج پیدا کر دی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ سب نے ان اشعار کو بیحد پسند کیا ہے۔

سردار صاحب پھر بولے۔

نی اسیں مر گئے کمایاں کر دے نی ہرام کوڑے نارے

اجے تیرے بند نہ بنے —— ہائے نی اسیں مر گئے

اس دفعہ حسب معمول کافی داد ملی۔ لیکن داد کی حد تو اُسوقت ہوئی۔ جب سردار صاحب نے غالب کی وہ "مثلث" سنائی۔ جس کا ٹیپ کا مصرعہ یہ تھا ہے

موڑیں بابا ڈانگ والیا چھیٹی

ڈیڑھ گھنٹہ گذر گیا۔ اور سردار پریتم سنگھ مؤرخ، شاعر اور ماہر ادبیات کی تقریر ختم ہوئی۔ اسکے بعد مرزا کاظم اُٹھے۔ اور انہوں نے نہایت فصیح جرمن زبان میں بیان کیا۔ کہ پروفیسر نے جس قابلیت سے غالب اور گوئٹے کا موازنہ کیا ہے شاید ہی آجتک کسی نے کیا ہو۔ کم از کم برلن میں تو ایسی تقریر آجتک نہیں ہوئی ہو گی۔ اور مجھے فخر ہے۔ کہ میرے ملک نے پروفیسر صاحب جیسے باکمال آدمی پیدا کئے ہیں میں اس پوری تقریر کا ترجمہ برلن کے اخبارات میں شائع کراؤنگا۔ اور آپ دیکھیں گے۔ کہ میرے وطن کے مایۂ ناز ماہر ادبیات نے علم و فضل کے کیا کیا دریا بہائے ہیں۔ میں آپ صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ کہ آپنے پروفیسر صاحب کے

خیالات سُننے کی تکلیف گوارا فرمائی ۔

اس کے بعد صاحب صدر اُٹھے۔ اور انہوں نے پروفیسر صاحب اور مرزا کاظم کا شکریہ پبلک کی طرف سے ادا کیا۔ اور جلسہ کے اختتام کا اعلان کیا۔ پھر کیا تھا۔ بڑے بڑے ادیب، اخبار نویس اور رئیس سردار صاحب سے مصافحہ کرنے کو لپکے۔ اور آپ کو بڑی مشکل سے ہال کے دروازہ تک لیجایا گیا۔ اسی رات کو مرزا کاظم پروفیسر پریتم سنگھ کو ٹرین پہ سوار کرانے کے لئے اسٹیشن تک لے گئے۔ اور دونوں کی جیبیں نوٹوں سے پُر تھیں ۔

بڑا بھائی

رامانند ساگر کاشمیری

یہ افسانہ آل انڈیا ریڈیو سے نشر کیا جا چکا ہے اور
ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو کی اجازت سے شائع کیا جا رہا ہے

چاندنی رات کیا تھی۔ گویا ایک ساقیٔ خاموشی پسند جس نے ایک عالم کو چاندنی کی شراب سے نہلا دیا تھا۔ کائنات کا ہر ذرّہ خاموش تھا۔ گو ابھی آغازِ شب تھا لیکن چاندنی میں لپٹی ہوئی رات کے تیور کچھ ایسے مدہوش کن تھے۔ کہ کوئی بھی ہوش میں نہ رہ سکا۔ سب بیہوشی کی نیند سو گئے۔

گرمی کا موسم۔ شہر کے اس حصے میں۔ جسے غریبوں کی بستی کہتے ہیں۔ تمام گلی کوچے چارپائیوں سے پٹے پڑے ہیں۔ پرانی طرز کے ایک دو لیمپوں کی مدھم روشنی میں ایک تیرہ چودہ سالہ لڑکا آہستہ آہستہ چلا رہا ہے۔ لباس بوسیدہ چہرہ بے رونق۔ لیکن چال ڈھال قدرے شاعرانہ۔ وہ ایک جھونپڑی نما مکان کے سامنے ٹھہر گیا۔ ایک چارپائی خالی پڑی تھی۔ ساتھ والی چارپائی پر دو بچے سو رہے تھے۔ سات سالہ منشی اور دس سال کا مراری۔ دونوں کو میٹھی نیند کی گود میں دیکھ کر اسکے بے رونق چہرہ پر مسکراہٹ کا ایک پھیکا سا خط کھنچ گیا۔ گویا ایک اکیلا ستارہ چمکا اور اسکی روشنی

آسمان کی مہیب وسعتوں میں کھو گئی۔

لڑکا آہستہ سے چارپائی پر دراز ہو گیا۔
اس کی نگاہیں آسمان کے ستاروں میں اٹک گئیں۔ کیا جانے وہ کیا دیکھتا رہا دیکھتے دیکھتے اسکی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ فوراً اُٹھ بیٹھا۔ جلدی سے آنکھیں پونچھ لیں۔ اور یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ اس کے آنسو کسی نے نہیں دیکھے وہ پھر لیٹ گیا۔

لیکن وہ سو نہ سکا۔ جب جب وہ آنکھیں بند کرتا۔ تو بھوک کی انتڑیں پیٹ میں کلبلانے لگتیں۔ اس نے دو دن کے بھوکے پیٹ کو بہتیرا سمجھانے کی کوشش کی۔ کہ "جب چھوٹے بھائی اور بہن نے کھا لیا۔ تو سمجھو میں نے ہی کھا لیا۔ لیکن پیٹ کا دل تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ جو وہ ہری شنکر کے جذبات محسوس کرتا۔ بھوکا پیٹ برابر چیختا چلاتا رہا۔ بالآخر وہ مجبور ہو کر آہستہ سے دروازہ کھول کر مکان میں داخل ہو گیا۔ اندھیرے میں اس نے ہنڈیا ٹٹولی۔ وہ بالکل خالی تھی۔ ہری شنکر کا دل بیٹھ گیا۔ اسنے پیٹ کو ہاتھ سے دبا لیا۔ لیکن بھوک کا شیر کب مانتا ہے۔
ہری شنکر کیلئے اب ایک ہی چارہ تھا۔ کہ وہ زور سے چلائے۔ جب انسان کا کوئی غمخوار نہ ہو۔ تو ایسے ہی موقعے پر اسکو تسکین دینے کے لئے قدرت نے کئی بے بہا موتیوں کو آنسو بنکر ٹپکنے کے لئے وقف کر رکھا ہے۔

وہ رونا ہی چاہتا تھا۔ کہ کئی سال پیشتر کا ایک واقعہ اسکی آنکھوں میں پھر گیا۔ جب موت نے اسکی بیوہ ماں کا دامن تھاما ہوا تھا۔ اور وہ ٹوٹی ہوئی آواز میں دس گیارہ سالہ ہری شنکر کو سمجھا رہی تھی۔ کہ یہ چھوٹے بہن اور بھائی اب تمہارے

آسرے ہیں۔ دیکھنا بیٹیا۔ اب انکی ماں نہ ہو گی جو انکا لالن پالن برداشت کریگی۔ اب انکے ساتھ ماں کا لاڈ، اور باپ کا پیار تمہیں نے کرنا ہے۔ دیکھنا، ماں باپ کی کمی محسوس کر کے یہ ننھے پودے کہیں مرجھا نہ جائیں۔ اور اگر ان کو کچھ ہو گیا۔ تو پھر تمہاری ماں نہ ہو گی۔ جو تمہارے لئے اور بھائی جن سکے۔ بیٹیا! دنیا میں سب کچھ مل سکتا ہے۔ لیکن ماں کا پیٹ نہیں ملتا۔ یہ بھی جانتی ہوں۔ کہ تم خود ابھی ننھے ہو خود تمہیں کس کے حوالے...... یہاں آکر ماں پھوٹ پڑی تھی۔ آخر میں نے جاتے جاتے محض اتنا کہا تھا۔ "بھگوان تمہیں لبدھوں جتنی عقل دے"۔ ماں کی دعا خالی نہ گئی۔ اسکے ان الفاظ نے ہری شنکر کی جوانی چھین لی۔ وہ بچپن سے سیدھا بڑھاپے میں داخل ہو گیا۔ اس میں شباب کی شوخیاں ظاہر ہی نہ ہو پائیں۔ اس کمسنی ہی میں بچپن کی شوخی یا جوانی البیلے پن کے بجائے اس میں بزرگوں کی سی متانت اور سنجیدگی آگئی تھی۔ اسے اپنے "بڑا بھائی" ہونے کا بہت احساس تھا۔ ماں کی باتیں اسکی لوحِ دل پر کندہ ہو چکی تھیں۔ ماں کی آخری خواہش بدلانا ہی اس نے اپنا ایمان بنا رکھا تھا۔ اس نے اپنی تمام تر خواہشات، اپنے تمام جذبات اور ولولوں کو چھوٹے بھائی اور بہن کے چاؤ چونچلوں پر نچھاور کر دیا۔ ان کو پہلے کھلاتا۔ خود بعد میں کھاتا۔ چنانچہ آج دو روز سے وہ اسی لئے بہت رات گئے گھر لوٹتا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا۔ کہ گھر میں محض دو بچوں ہی کے کھانے کے لئے کافی خوراک ہے۔ چنانچہ جب وہ انتظار سے تھک کر خود کھانا کھا کر سو رہتے تب یہ گھر آتا۔ تاکہ انہیں معلوم نہ ہو۔ کہ "بڑے بھائی" نے کھانا نہیں کھایا۔ لیکن آج اسکی قوتِ برداشت جواب دے گئی تھی۔ وہ چلانا چاہتا تھا۔ کہ ماں کے آخری

الفاظ اس کے کانوں میں اس زور سے گونجے۔ کہ کلبلا نے ہیبٹ کی چیخ و پکار انمیں گم ہو گئی۔ جو دل ہاتھوں سے نکلا پڑتا تھا۔ اس نے پھر ڈھارس باندھی۔ اس نے پانی کا ایک گلاس بھر کر پی لیا۔ پھر دوسرا اور پھر تیسرا بھی! اور چارپائی پر لیٹ گیا۔

دفعتہً کسی خیال سے چونک کر وہ پھر اُٹھ بیٹھا۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک روپیہ نکالا۔ یہ اس کا آخری اثاثہ تھا۔ ماں مرتے وقت چاندی کے دو چار زیور چھوڑ گئی تھی۔ جو ایک ایک کر کے تمام بک گئے تھے۔ ایک آخری کڑا۔ جو بچ گیا تھا۔ ہری شنکر آج اسے بھی بیچ آیا تھا۔ دوسرے روز دسہرے کا تیوہار تھا۔ اور وہ یہ برداشت نہ کر سکتا تھا۔ کہ "بڑے بھائی" کے ہوتے ہوئے مراری اور لشنی دوسرے بچوں کو مٹھائی کھاتے اور کھلونے لاتے دیکھکر دل مسوس لیں اس کے سامنے محض ایک مقصد تھا۔ کہ ان دونوں کو کسی طرح ماں کی کمی محسوس نہ ہو۔ اُسے آئندہ کی فکر نہ تھی۔ اسوقت اُسے یہ خیال نہ آیا۔ کہ یہ روپیہ ختم ہو جانے کے بعد..... پھر کیا کھائیں گے۔ اُسے اپنا فرض پورا کرنا تھا! اور وہ یہ سمجھتا تھا کہ ان بچوں کو روٹی مہیا کرنا کسی بالائی طاقت کا فرض ہے۔

ہُوا بھی ایسا ہی۔ انہی دنوں ہری شنکر کو کسی رئیس کے ہاں ملازمت مل گئی۔ اسکے چار سالہ بچے کو کھلانے کی۔ اب اس کی قدرے آرام سے کٹنے لگی۔ حتیٰ کہ نجانے کس کونے سے لشنی کی جوانی عود کر آئی۔ لشنی کی آنکھوں میں معصومیت کی جگہ حیا نے لے لی۔ وہ اب گھر سے باہر نہ نکلتی۔ ایک روز ایک امیرزادے نے ہری شنکر کو راہ چلتے بلایا۔ اور کہنے لگا "لشنی کو صبح ہمارے گھر بھیجنا بنا"! کچھ تعجب اور کچھ گھبراہٹ کے عالم میں ہری شنکر کے منہ سے نکل گیا۔ "تمہارے گھر؟ آخر کیوں؟" امیرزادہ بولا۔

ماں کہتی تھیں۔ کہ چوکہ برتن کر جایا کرے گی۔ ارے بھائی۔ تمہارے کچھ تھوڑی امداد ہو جائے گی"!

جیسے کسی نے ہری شنکر کے دل پر گھونسا مارا۔ اس نے امیر زادے کی آنکھوں میں ایک برق آگیں چنگاری چمکتی دیکھی۔ اس چنگاری نے اسکے سینہ میں آگ پھونک دی۔ ایک لمحہ کے لئے وہ یہ بھول گیا۔ کہ وہ مفلس ہے۔ اور کہ یہ بے عزتیاں اس کو وراثت میں ملی ہیں۔ وہ سوچنے لگا۔ کہ "بستی۔ اور میرے ہوتے ہوئے لوگوں کے جھوٹے برتن صاف کرے"۔ رہ رہ کر اس امیر زادے کی آنکھوں کے نفسانی شرارے ہری شنکر کی رگوں میں آگ چھوڑتے رہے تھے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ اسوقت ہری شنکر کے ہاتھوں کوئی اندوہناک کیوں نکر نہ ہوا۔ البتہ وہ کسی طرح موقعہ ٹال کر چلا گیا۔ کاش یہ امیر لوگ کسی غریب "بڑے بھائی" کے سینے میں ہاتھ ڈالکر اسکے دل کو ٹٹول سکتے۔ اس واقعہ کے بعد ایک اور غم نے ہری شنکر کا دامن تھام لیا۔ اب وہ رات دن بستی کی شادی کی فکر میں رہنے لگا۔

مراری بھی اب کام کرنے کے لائق ہو گیا تھا۔ لیکن وہ کرتا دھرتا کچھ نہ تھا بلکہ یوں کہو۔ کہ "بڑے بھائی" کی لا انتہا محبت نے اسکو بگاڑ دیا۔ عادات و خصلات میں وہ اپنے بھائی کی ضد تھا۔ اسے بُری صحبت لگ چکی تھی۔ کئی مرتبہ بستی کے لوگوں نے بلکہ خود بستی نے بھی مراری کی شرارتوں اور زیادتیوں کی شکایت کی۔ ہر مرتبہ ہری شنکر اُن لوگوں کو یہ کہتا رہ بھٹی۔ میں سمجھا دونگا"۔ لیکن جب مراری اسکے سامنے ہوتا۔ تو سمجھانے دل کے کس کونے سے محبت و شفقت کا ایک چشمہ پھوٹ پڑتا۔ جو اپنی رو میں تمام شکوے شکایات بہالے جاتا۔ ہری شنکر کا گلا بند ہو جاتا۔ اور وہ محض اتنا کہہ پاتا

کہ چھوٹے بھائی کو اپنی آغوش میں بھینچ لے۔ اس سے زیادہ کچھ کرنے کی اسمیں سکت ہی نہ باقی رہتی۔ ایسے موقعوں پر کئی مرتبہ ہری شنکر کی آنکھوں میں ایک آدھ آنسو بھی تیر اُٹھتا۔ ان باتوں سے مراری اور بگڑ گیا۔

ایک روز ہری شنکر خوش خوش گھر لوٹا۔ وہ تمام دن لشمی اور مراری کو ایک خوشخبری سنانے کے لئے بیتاب رہا تھا۔ چھٹی ملتے ہی وہ بھاگم بھاگ گھر آیا۔ تمام راہ وہ لشمی کی شادی کا تصور باندھتا آیا۔ آج اس نے لشمی کی شادی طے کر دی تھی۔ انہیں مسرت انگیز خیالات میں غلطاں جب وہ گھر پہنچا۔ تو اس نے لشمی کو چشم براہ پایا وہ دروازے کی آڑ میں سے اسی کا راہ تک رہی تھی۔ اندر آتے ہی اس نے اسکا دامن تھام لیا۔ اسکی آنکھوں میں دو موٹے موٹے آنسو تھے۔ جو محض ہری شنکر کی آمد کے منتظر تھے۔ اس کے آتے ہی وہ بھی لشمی کے دل کی مانند قرار کھو کر پھوٹ پڑے۔ ہری شنکر نے فرطِ استعجاب میں پوچھا "لشمی۔ کیوں"۔ لشمی نے کہا "مراری ...... " اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ البتہ کلمہ پورا کرنے کے لئے آنسو آنکھوں سے نکل آئے۔ ہری شنکر نے مضطرب ہو کر پوچھا "کہاں ہے مراری ......" لشمی نے اندر کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بجلی کی مانند اندر گیا۔ مراری اوندھے منہ پڑا تھا۔ اس کے قریب پہنچتے ہی ہری شنکر کو سارا معاملہ سوجھ گیا۔ آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ مراری آج شراب پی آیا تھا۔ یہ اسکی بری صحبت کا عامل تھا ہری شنکر کا چہرہ یکبارگی تمتما اُٹھا۔ اس نے کہا۔ اسی طرح پڑا رہنے دے۔ اسے پانی تک بھی نہ پوچھ"۔ لیکن نجانے کیوں وہ خود اس پر عمل نہ کر سکا۔ کبھی وہ بھائی کا سر سہلاتا۔ اور کبھی تلوے۔ اسی طرح اس نے تمام رات آنکھوں ہی میں کاٹ

دی۔ آخر "بڑا بھائی" نبھانا۔

اس واقعہ کے بعد مراری اور کھل کھیلا۔ یہ واقعہ اسی قسم کے مسلسل واقعات کا آغاز ثابت ہوا۔ حتیٰ کہ مراری کا شراب پینا مسلّم ہو گیا۔ بھائی کی تمام کوششوں کا نتیجہ اگر کچھ نہ ہوا تو یہ مراری نے شراب کے ساتھ ساتھ جوا بھی شروع کر دیا۔ اور جوئے کا لازم یعنی عیاری بھی اس میں بدرجہ اتم آموجود ہوئی۔ ہری شنکر ان باتوں کو دیکھتا۔ تو خون کے گھونٹ پیتا۔ اس نے مراری کو سدھارنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ ریت میں پانی نے اثر کرنا تھا نہ کیا۔

ہری شنکر نے کسی نہ کسی طرح نشنی کا بھار اتارنے کا بندوبست کیا۔ سسرال جاتے وقت نشنی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر بھائی سے کہا۔ "بھیا۔ مراری کا کیا بنیگا"

ہری شنکر نے اسے ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔

"اس کا کیوں فکر کرتی ہو نشنی۔ وہ سدھر ہی جائیگا۔ اور پھر اسکا بڑا بھائی جو موجود ہے۔ جب تک میں ہوں۔ تم دونوں کیوں فکر کرو"۔

ہری شنکر کے سر پر جو سب سے بھاری بوجھ تھا۔ وہ نشنی کے سسرال چلے جانے پر ہلکا ہو گیا۔ اب رہ گئیں مراری کی اوباشیاں اور ہری شنکر۔

ایک ضروری امر کا ذکر تو رہا ہی جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے۔ کہ زمانہ کی ستم ظریفیوں نے ہری شنکر کی شوخی چھین کر اسے سنجیدہ و متین بنا دیا تھا۔ لیکن اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کہ وہ نوجوان تھا! وہ ایک شاعرانہ دل رکھتا تھا۔ اور ایک شاعر کے دل پر جو گذرا کرتی ہے وہ اس پر بھی بیت چکی تھی! اس کا دل بھی

کسی کی زلفوں کے پیچ میں کھو گیا تھا۔ وہ بھی کسی کے رُخ پہ نثار ہو چکا تھا۔ یہ علیحدہ بات ہے۔ کہ واقعات کے اُلٹ پھیر نے اس کے عشق میں سرگرمی نہ پیدا ہونے دی تھی۔ اور نہ ابھی تک اسکی بُو ہی پھیل پائی۔ لیکن اس ظاہری بے رنگی نے اندرونی طور پر اسکی محبت کو اس قدر گہرے رنگ سے داغ دیا تھا۔ کہ جیسے سینکڑوں ہزاروں طوفانوں کا پانی بھی دھو نہ سکے۔ وہ دن کے وقت دکھائی دینے والے آسمان کی مانند تھا جس کے سینے میں سینکڑوں ارمانوں کا داغ ستاروں کی شکل میں موجود ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ظاہر نظر نہیں پڑتے۔ اس کی اتھاہ محبت پر سنجیدگی کچھ اس طرح پردہ کئے ہوئے تھی۔ جس طرح کسی گہرے سمندر کی خاموش سطح جس کے پردے میں ہزاروں لہریں تمناؤں کی مانند اُٹھ رہی ہوتی ہیں۔ جس کے دل میں کئی پُر شور طوفان اُٹھتے ہیں۔ اور دل ہی میں بیٹھ جاتے ہیں۔ لیکن سطح پر ایک لابدی سکون ظاہر ہوتا ہے۔

غرضیکہ اسے چمپا سے عشق تھا۔ اور آپ جانتے ہیں۔ کہ ایک سنجیدہ شخص کا عشق کس قدر پختہ ہوتا ہے۔ چمپا ایک غریب گھسیارے کی لڑکی۔ شہر سے باہر ایک جھونپڑے میں رہتی تھی۔ جہاں ہری شنکر ہر روز اپنے ننھے مالک کو گاڑی میں بٹھا کر ہوا خوری کے لئے لے جاتا۔ اس نے چمپا سے شادی کی ہوتی لیکن آج تک "بڑے بھائی" کا فرض چمپا اور اس کی شادی میں مانع تھا کیونکہ وہ محسوس کرتا تھا۔ کہ لشتنی کی شادی کا مقدس فرض پورا کئے بغیر وہ شادی کا حق نہیں رکھتا۔

لیکن اب اس نے چمپا کے ساتھ اپنے دامن کی گرہ باندھنے کی بات طے کر

لی۔ اس کے لئے کسی خاص تیاری کی ضرورت نہ تھی۔ دونوں کے پاس پریم کی دولت کے سوا کچھ نہ تھا۔

جوں جوں مقررہ روز نزدیک تر ہوتا جا رہا تھا۔ ہری شنکر کے تصوّر کے سامنے نئی نئی دنیائیں پھیلتی جا رہی تھیں۔ کئی مرتبہ وہ آئندہ زندگی کے تخیل میں کھو جاتا۔ چمپا کا خیال ایک نشہ تھا جو رفتہ رفتہ اس پر چھا گیا۔ لیکن واقعات کے ایک ہی چھکے نے اسکی شراب میں نمک گھول دیا۔

ایک روز اس نے مراری اور اسکے اوباش دوستوں کو باتیں کرتے سنا۔ وہ لوگ اُسے بھڑکا رہے تھے۔ اور ہری شنکر کے کانوں میں مراری کے یہ الفاظ پڑے۔ "ہاں۔ بھائی کو میری کیا فکر۔ اُسے تو اپنی شادی کی دُھن سما رہی ہے۔ میری ماں ہوتی تو کوئی میرا بھی خیال رکھتا"۔ یہ الفاظ سن لینے کے بعد ہری شنکر کی حالت بعینہٖ اس خرمن کی مانند تھی جس پر ابھی بجلی گری ہو۔ وہ اس ہرنی کی مانند تڑپ اُٹھا جس کے بچے کو شکاری کے تیر نے موت کا سندیس سنایا ہو۔ اس روز وہ ماں کی تصویر کے سامنے دل کھول کر رو دیا۔ اس نے بلک بلک کر ماں سے کہا۔ "تم بتاؤ ماں۔ میں کس دن مراری کا خیال دل سے بھلایا۔ کس دن اس کو کھلانے سے پہلے خود کھایا۔ میں نے اس کو ذرہ بھر تکلیف سے بچانے کے لئے اپنے سر پر پہاڑ نہ اُٹھائے؟ کیا میں نے اس کے تمام ناز برداشت نہ کئے۔ کیا میں نے اسکے دل کو کوئی ٹھیس پہنچنے دی۔ کیا میں نے وہ کچھ نہ کیا۔ جو شاید تم بھی نہ کر سکتیں۔ تب کیوں اس نے ایسا کہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ماں! تم نے مجھے "بڑا بھائی" کیوں بنایا"! ماں کی تصویر نے نجانے ہری شنکر کیا کہا۔ البتہ کسی کو یہ معلوم نہ سکا۔ کہ ہری شنکر کی شادی

یکلخت کیوں رُک گئی۔ اب ہری شنکر کا سینہ ایک خاموش آگ تھا جس کی ارمانوں کی لپٹیں نہیں اُٹھتیں۔

اب ہری شنکر مراری کے لئے کسی لڑکی کی تلاش میں تھا۔ انہی دنوں ایک اور واقعہ ایسا ہوا۔ جس نے بساط ہی اُلٹ دی۔ اس نے سُنا۔ کہ مراری اب کہتا ہے کہ وہ اسی لڑکی سے شادی کریگا۔ کہ جو ہری شنکر نے اپنے لیئے تلاش کی ہے۔ ہری شنکر کی برداشت کی حد ہو گئی۔ اسکا رشتۂ صبر اس قدر تن گیا۔ کہ اب اسمیں لچک کی مطلق گنجائش نہ رہ گئی۔ اس نے مراری کو سمجھایا۔ لیکن جہاں تک سمجھ بوجھ کا جادو چلتا ہے مراری تو ان حدود کو پار کر چکا تھا۔ حتیٰ کہ ہری شنکر نے بھائی کے پاؤں پکڑ لئے۔ اور آنکھوں میں آنسو لاکر ایک نماجز گداگر کی مانند بھیک مانگی "مراری میرا سب کچھ تمہارا ہے۔ تم مجھ سے میری جان لے لو۔ لیکن یہ مطالبہ نہ کرو"۔ مراری یہ جان نہ سکا۔ کہ بھائی نے اس ایک فقرہ میں اپنی محبت۔ رشتہ برادرانہ اور پھر سب سے بڑھکر اپنی زندگی کا واسطہ ڈالا ہے۔ آخر وہ سمجھتا بھی کیونکر۔ قدرت نے اُسے بڑا بھائی نہ بنایا تھا۔ اس نے ناپائیدار نفس کی خاطر اس شئے کو رد کر دیا۔ کہ جس کا پلہ بہشت کی رحمتوں پر بھی بھاری ہے۔ اس نے "بڑے بھائی" کی محبت کو ٹھوکر مار دی۔

مراری کی ضد دیکھکر ہری شنکر نے خیال کیا۔ شاید سخت الفاظ سے کام نکل آئے۔ چنانچہ وہ اُسے جھڑک جھپٹ کر کسی کام کو چلا گیا۔ واپس لوٹا تو ایک چھوٹے سے لڑکے نے اُسے بتایا۔ کہ "آج مراری بھیا نے بہت شراب پی ہے۔ اور ایک چاقو لیکر یہ کہتا ہوا کہیں چلا گیا ہے۔ کہ "اگر وہ مجھے نہیں دیتا۔ تو میں اسکے لئے بھی نہ

"چھوڑ دونگا" ہری شنکر کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے سوچا کہ نشے میں بدمست مراری سے کچھ بھی بعید نہیں۔ اس میں کھڑا رہنے کی سکت نہ رہی تھی۔ لیکن اس کے باوجود نجانے کس طرح وہ ہوا کے پر لگا کر بھاگا۔ راہ میں وہ دل کو ڈھارس بندھاتا گیا۔ کہ "مراری کچھ بھی ہو۔ آخر میرا بھائی ہے۔ وہ اتنا کبھی نہیں کر سکتا" چمپا کے جھونپڑے کے قریب پہنچکر اسکے پاؤں من من کے ہو گئے۔ اس کا دل طوفان زدہ کشتی کی مانند ہچکولے کھانے لگا۔ وہ جھونپڑے میں داخل ہی ہونے لگا۔ کہ مراری باہر نکلا۔ ایک دوسرے کو دیکھکر دونوں ٹھٹک گئے۔ مراری کی نیچی نگاہوں سے ہری شنکر سمجھ گیا۔ کہ جو نہ ہونا تھا وہ ہو گیا۔ وہ کھڑا نہ رہ سکا۔ ندی کے طوفان زدہ کنارے کی مانند وہ وہیں بیٹھ گیا۔ اس وقت اسکے دل پر جو بیت رہی تھی اس کو بیان کرنے کا نہ قلم کو یارا ہے اور نہ اس کا صحیح اندازہ ہی کیا جا سکتا ہے سمجھ لیجئے۔ کہ ایک ایسا شکار تھا جس کے سینے کو کئی شکاریوں کے چھوڑے ہوئے تیروں نے ایک ساتھ لگ کر شق کیا ہو۔ اور اس پر ستم یہ کہ اسکی جان اٹک گئی ہو۔

ادھر مراری کی یہ حالت تھی۔ کہ قتل جیسا خوفناک جرم کرنے کے بعد اسکا تمام نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ یہ فطرت کا تقاضا تھا۔ کہ اسوقت اسکے دل میں وہ خفتہ جذبات سر اٹھا رہے تھے۔ کہ جن کو بیدار کرنے کے لئے "بڑے بھائی" نے اپنی تمام طاقت لگا دی تھی۔ لیکن یہ اسوقت ہوا۔ جب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ ہری شنکر نے محض اتنا کیا۔ کہ مراری کو ماں کی تصویر کے سامنے لے گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس چوٹ نے ہری شنکر کے جذبۂ احساس کو سُن کر دیا تھا۔ اسکی آنکھوں میں

کوئی نہ آنسو تھے۔ نہ لب پر آہ۔ ہری شنکر نے ماں سے صرف اتنا کہا۔ "تم نے دیکھا۔ ماں۔ مراری نے کیا کیا۔ اب یہ امانت مجھ سے نہیں سنبھالی جاتی۔ اسے تمہیں واپس سونپتا ہوں۔ مجھے "بڑے بھائی" کے فرائض سے سبکدوش کر دو۔" ان دو مختصر فقروں نے مراری کی آنکھوں کے سامنے بھائی کی محبت کا وہ باب کھول دیا۔ جس کا خاتمہ نہ تھا اس کے دل نے اس پر پھٹکار ڈالی اس نے چاہا کہ ایک بار پھر ہری شنکر اسی طرح محبت بھرے الفاظ میں اسے سمجھائے لیکن وقت بیت چکا تھا۔

ہری شنکر نے عدالت میں خود خونی ہونے کا اقرار کیا۔ مراری کا ضمیر یہ برداشت نہ کر سکا۔ اس نے بھی عدالت کو یقین دلانے کی کوشش کی۔ کہ ہری شنکر نہیں۔ وہ خونی ہے۔ عدالت عجیب مخمصے میں پھنس گئی۔ فیصلہ سنانے میں کئی روز لگ گئے۔ عدالت کوشش کرنے پر بھی کوئی فیصلہ نہ کر پائی۔ دونوں بھائی کسی خوفناک گہرائی والے سمندر کی مانند سنجیدہ تھے۔ دونوں کے دلوں میں کیا جانے کیا کیا زیر و زبر ہو رہا تھا ایک روز موقعہ ملا۔ تو ہری شنکر کھلا۔ اس نے چھوٹے بھائی سے کہا۔ "مراری۔ آخر تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔ مجھے تباہ کیوں نہیں ہونے دیتے۔" مراری برداشت نہ کر سکا۔ وہ بھائی کے قدموں میں گر گیا۔ اور روتا ہوا۔ کہنے لگا "میرا گناہ بخش دو بھیا۔" اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ بھائی کے اشکہائے ندامت کو دیکھ کر "بڑے بھائی" کا ضبط بھی ٹوٹ گیا۔ وہ ایک رکے ہوئے نالے کی مانند بہ نکلا۔ روتے روتے اس نے بھائی کو اٹھا کر گلے سے لگا لیا۔ اسے جی بھر کے پیار کیا۔ اور بولا۔ "شاباش۔ تم سے ایسی ہی امید تھی۔ کیا آج بھی تم "بڑے بھائی" کی ایک درخواست قبول نہ کرو گے۔" مراری بولا۔ "درخواست نہیں۔ بھائی۔ تم حکم کرو۔ تمہارا ہر لفظ میرے لئے قانون ہے۔" ہری شنکر

نے آہستگی سے جواب دیا "تم مجھے مر جانے دو"۔ مراری کا دم رک گیا۔ بڑا بھائی کہتا گیا۔ مراری۔ آج پہلی مرتبہ "بڑے بھائی" کی درخواست کو منظور کر دو۔ اب مجھے اور زیادہ تکلیف نہ دو۔ موجِ خون میرے سر سے گزر چکی ہے۔ اب مجھ میں زندگی کا بوجھ برداشت کرنے کی سکت باقی نہیں میرے چھوڑ دینے کے بعد اب میری کشتیٔ حیات کو طوفان میں نہ دھکیلو۔ اس کے لئے ڈوب جانے ہی میں راحت ہے۔ میں تم سے زندگی بھر کی محبت کے صلے میں صرف موت کی بھیک مانگتا ہوں"۔ مراری جانتا تھا۔ کہ وہ اپنے ہاتھوں اپنے جھونپڑے کو آگ لگا رہا ہے اپنے ہی تیر سے اپنا سینہ چھید رہا ہے لیکن آج وہ اس مرحلے پر پہنچ چکا تھا۔ کہ جہاں "بڑے بھائی" کے حکم سے سوال نافرمانی کرنے کی مطلق گنجائش نہ رہ گئی تھی۔ اس نے اپنی عمر میں پہلی مرتبہ "بڑے بھائی" کی خواہش پوری کر کے اسکی زندگی بھر کی محبت کا صلہ چکا دیا۔ اور یہی ایک خیال کہ اس کا "چھوٹا بھائی" آخر کار فرمانبردار نکلا۔ پھانسی کے تختے پر بھی بڑے بھائی کو تسلی دے رہا تھا۔

بھول

اختر انصاری

اُس نے کتاب ہاتھ سے رکھی اور مونڈھے پر بیٹھے بیٹھے زور سے انگڑائی لی۔ جب انگڑائی لینے کے بعد جسم اپنی اصلی حالت پر آگیا۔ تو ہاتھ بڑھا کر چارپائی پر سے گھڑی اُٹھائی۔ اور وقت دیکھا۔ گھڑی میں ڈیڑھ بجا تھا۔ حالانکہ شام ہو چکی تھی اور سامنے سورج غروب ہو رہا تھا۔ وہ گھڑی کو اپنے کان کے پاس لے گیا۔ ٹک ٹک کی آواز بند تھی۔ اُس نے گھڑی کو اُنگلیوں میں دبا کر ہلایا اور دس پانچ جھٹکے دیئے۔ سیکنڈ کی سوئی کو غور سے دیکھا، لیکن وہ اپنی جگہ پہ قائم تھی۔ ایک دفعہ پھر زور سے ہلایا اور جھٹکے دیئے۔ اور کان کے پاس لے گیا۔ وہ اب بھی خاموش تھی۔ اُسکے چہرے پر تلخی اور جھنجھلاہٹ کی ایک کیفیت پیدا ہوئی۔ جس کا اظہار اگر الفاظ میں کیا جاتا تو یوں ہوتا: "بند ہو گئی کم بخت! لعنت ہو اس پہ!"

اُس نے ناخن سے گھڑی کو کھولا۔ جامد و ساکت پرزوں کو لمحہ بھر دیکھتا رہا پھر اُنگلی سے بال کمانی کو ہلایا۔ پرزوں نے تھوڑی دیر تک جنبش کی۔ اور پھر بے جان ہو کر رُک گیا۔ اب جو کیفیت اُسکے چہرے پر ظاہر ہوئی اُس کا مطلب یہ تھا۔ "نامراد! ملعون! جی چاہتا ہے تجھے زمین پر زور سے پٹخ دوں۔ اور جوتے سے رگڑ

کر بیس ڈالوں گا" لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا۔ ڈھکنے کو بند کر کے گھڑی کو بے پروائی کے ساتھ چارپائی پر ڈال دیا۔

اس پر افسردگی طاری ہو گئی۔ ایسی افسردگی جو کسی بڑے نقصان یا کسی شدید محرومی کے احساس سے پیدا ہوتی ہے "ابھی دو مہینے ہوئے اس کی صفائی کرائی تھی"۔ اس نے اپنے دل میں کہا "اور بارہ آنے خرچ کئے تھے۔ معلوم نہیں حرامزادہ صفائی کرتا بھی ہے یا نہیں۔ گزشتہ دو تین سال میں کتنی دفعہ صفائی کرا چکا ہوں! اب اُس کے پاس لے جاؤں گا تو دھڑ سے کہہ دیگا! یہ گھڑی میلی ہو گئی ہے صاحب! صفائی چاہیئے ہے۔ تیری ایسی کی تیسی! بد معاش کہیں کا! بے ایمانی کے سوا کچھ آتا ہی نہیں۔ گھڑی نہ ہوئی عذاب ہو گیا۔ ایک سہ ماہی ٹیکس! وہ میونسپلٹی کا بل آیا ہوا ہے۔ ہاؤس ٹیکس ادا کرنا ہے۔ یہ ٹیکس ہمیں ترکے میں ملا ہے۔ خوب چیز تھے ہمارے والد صاحب بھی! نہ چھوڑ مرے لاکھ دو لاکھ روپیہ ہمارے لئے۔ جو آج ہم چین کی بنسی بجاتے اور نوکری کے جھنجھٹوں سے آزاد ہوتے۔ چھوڑ کر مرے بھی تو کیا چیز؟ گیارہ روپے سالانہ ٹیکس! سال بسال ادا کئے جاؤ۔ ابے یار کیوں ناشکری کرتا ہے؟ اتنا بڑا مکان رہنے کو ملا ہوا ہے۔ بالکل مفت میں! اور ٹیکس کا رونا روتا ہے۔ چھی! کیا مکان ہے! کھنڈر اور ویرانے سے بدتر۔ اس کو مکان کہتے ہیں؟ یہ تو تکیہ ہے، فقیر کا تکیہ! سادھوؤں کا استھان! دھونی رمائے پڑے رہو۔ گرتی ہوئی دیواروں کو سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا کرو۔ اور ٹیکس ادا کئے جاؤ۔ کیا تھی آخری تاریخ اُس کی ادائی کی؟ تاریخ تو کبھی کی نکل چکی ہو گی۔ آج تک کبھی تاریخ پر ادا

ہی نہیں ہوا۔ جب قرقی کا وارنٹ آتا ہے تو ادا ہوتا ہے۔ اب کے بھی یہی ہو گا۔ قرقی کا وارنٹ آئے گا تو بھاگا بھاگا پھروں گا۔ آخر کہاں سے لاؤں گا گیارہ بارہ روپے؟"

اُس نے سراسیمہ ہو کر چاروں طرف ایک نظر ڈالی۔ سامنے چارپائی پر گھڑی پڑی ہوئی تھی "لعنت ہے اس گھڑی پر! پہلے جاؤ تانگا گھڑی ساز کے پاس اور بارہ آنے اُس کی نذر کروں گا۔ کیسی ناکارہ گھڑی ہے کم بخت! سولہ روپے کی خریدی اور دو تین برس میں کتنے ہی روپے اُوپر سے کھا گئی۔ کیا فائدہ ایسی گھڑی رکھنے سے؟ اصل میں بڑی چُوک ہوئی تم سے۔ وہ والدہ کی جیبی گھڑی تم کو اپنے ہی پاس رکھنی چاہیئے تھی۔ کیا حرج تھا اگر وہ جیبی تھی؟ تم زنجیر نہ ڈالتے یونہی جیب میں پڑی رہا کرتی۔ اور آجکل تو بہت سے لوگ رسٹ واچ کو بھی جیب میں ہی رکھا کرتے ہیں۔ کلائی پر باندھنے کا فیشن تو کچھ پُرانا سا ہو گیا۔ مگر تم نے تو جیبی گھڑی کا استعمال فیشن کے خلاف سمجھا، اور اتنی لاجواب گھڑی اُٹھا کر اُس گدھے کو دے دی۔ ایسے نالائق بھائی بھی کس کام کے! جی چاہتا ہے پکڑ کے کھال ادھیڑ دوں۔ مارتے مارتے ادھ موا کر دوں! معلوم نہیں بازار میں جا کر بیچ آیا یا سچ مچ چوری ہو گئی۔ اگر مجھے خبر ہوتی کہ اس کا یہ حشر ہونے والا ہے تو کم بخت کو بیچ ڈالتا۔ ڈیڑھ سو روپے کی چیز تھی۔ کچھ نہ ملنے پر بھی ستر اسّی روپے مل جاتے اتنی بڑی رقم سے میرے کتنے کام نکلتے! برسوں سے ایک بائیسکل خریدنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ بائیسکل ہی خرید لیتا۔ یہ جو صبح شام سڑکوں پر گھسٹتا پھرتا ہوں اس سے تو نجات ملتی۔ معلوم نہیں کس مردود نے چرائی! اگر پتہ لگ جائے تو شو

کے بچے کو قید کرائے بغیر نہ چھوڑوں ۔ مگر یار تم تو اس فلسفے کے قائل ہو کہ آدمی بھوک سے تنگ آکر اور ضرورتا سے مجبور ہو کر چوری کرتا ہے ۔ اگر سب کی ضرورتیں حسب دلخواہ پوری ہوتی رہیں اور سماج مفلسوں اور ناداروں کے وجود سے پاک ہو ۔ تو چوری اور ڈکیتی کی وارداتیں بھی نہ ہوں ۔ لوگ بے ایمانی اور دغا بازی اسی لئے کرتے ہیں کہ اس کے سوا کچھ اور کر نہیں سکتے ۔ پھر جب تمہاری چیز چوری ہوتی ہے تو کیوں بھناتے ہو اور کیوں دانت پیس پیس کر چور کو گالیاں دیتے ہو ؟ کسی ضرورت مند نے ہی تمہاری گھڑی چرائی ہو گی ۔ نہیں جی یہ استدلال صحیح نہیں ہے ۔ ہمارا فلسفہ اپنی جگہ پہ بالکل ٹھیک ہے اور اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اُچکے اور اُٹھائی گیرے ہماری چیزیں چرا لے جایا کریں اور ہماری پیشانی پہ بل نہ پڑے ۔ آخر کیوں نہ افسوس ہو ہمیں اتنی عمدہ گھڑی کے چوری ہو جانے کا ؟ اور سارا قصور تو اس نامعقول ظفر کا ہے ۔ جو انتہا سے زیادہ بے پروا واقع ہوا ہے سارے دن واہی تباہی مارا پھرتا ہے ۔ نہ لکھنے پڑھنے کا ہوش ہے نہ اپنے مستقبل کا فکر ! آخر کیا کریں گے یہ دنیا میں ؟ ہائی اسکول ہی پاس نہیں ہوتا ۔ دو سال سے فیل ہو رہے ہیں ۔ یہ صحیح ہے کہ ہم نے بھی کبھی محنت کے ساتھ نہیں پڑھا ۔ مگر ہماری بات دوسری تھی ۔ والد زندہ تھے اور مال و دولت کی فراوانی تھی ۔ ہر طرح کا عیش و آرام مہیا تھا ۔ نہ کسی چیز کی کمی تھی نہ کسی بات کا غم ! اگر ہم نے تعلیم پر پوری توجہ صرف نہیں کی تو وہ ایک قدرتی بات تھی ۔ مگر ان کے حالات تو بہت مختلف ہیں ۔ ان کو تو زیادہ ہوش مندی کا ثبوت دینا چاہیئے ۔ اور پھر دو سال فیل ہونے کے کیا معنی ؟ ہم تو کبھی فیل نہیں ہوئے ۔ چوتھی جماعت میں جو داخل ہوئے

تو آخر تک پاس ہوتے ہی چلے گئے۔ بیس سال کی عمر میں ہی بی۔ اے کر لیتے۔ بی۔ اے! بی۔ اے! بی۔ اے! کیا فضول رٹ لگا رکھی ہے؟ کون سا تیر مارا ہے تم نے بی۔ اے پاس کر کے؟ اڑتیس روپے پانچ آنے تنخواہ ملتی ہے۔ اگر کل نکال دئے جاؤ تو بھوکے مرو۔ نہ مزدوری کر سکو نہ بھیک مانگ سکو۔ خود کشی کرتے ہی بن پڑے تو اس میں میرا کیا قصور رہے۔ میں نے تو بی۔ اے پاس کیا تھا؟ کاش والد ایک دو سال اور زندہ رہتے اور میں اُن کے سامنے بی۔ اے کر لیتا! اس ساری تباہی اور بربادی سے بچ جاتا۔ نہ قلم جرنلزم کے چکر میں پڑتا۔ نہ بمبئی جا کر اپنا وقت اور روپیہ برباد کرتا۔ نہ وہ اخبار نکالنے کی حماقت سرزد ہوتی۔ نہ دوستوں کو لوٹ مار کرنے کا موقع ملتا۔ بس بی۔ اے کرتے ہی وہ کوئی اچھی سی ملازمت دلوا دیتے پنجاب میں نائب تحصیلدار کرا دینا اُن کے لئے کوئی بات ہی نہ تھی۔ آج مزے سے کہیں تحصیلدار یا ڈپٹی کلکٹر ہوتے۔ بلکہ نائب تحصیلداری تو ہائی اسکول کے بعد ہی مل رہی تھی۔ لیکن واٹلی صاحب نے کہا، ابھی یہ لڑکا بہت نو عمر ہے۔ اس کو پڑھنے دیجئے۔ اور ایک نائب تحصیلداری پر ہی کیا موقوف ہے، وہ چاہتے، تو گورنمنٹ آف انڈیا میں کوئی عمدہ سی آسامی دلوا دیتے۔ آج کچھ نہیں تو چار سو پانسو روپے تنخواہ ہوتی اور ٹھاٹھ کے ساتھ نئی دہلی کے کسی بنگلے میں براج رہے ہوتے۔ نہ یہ تنگدستی ہوتی، نہ یہ مصیبتیں، اور نہ یہ ذلتیں! البتہ ایک بات ہے۔ مجھے زندگی کی ٹھوکروں میں تجربات کے خزانے بھی بہت ملے، زمانے کی حقیقت آشکارا ہو گئی۔ یہ معلوم ہوا کہ دنیا میں کتنا ظلم ہے، کتنی بے انصافی ہے، کس قدر خود غرضی اور مکاری ہے، اور انسانیت کے بدن کو کیسی کیسی بیماریاں

گھن کی طرح کھا رہی ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ان بیماریوں کی جڑ اور اصل بنیاد معلوم ہوئی۔ زندگی کا ایک روشن دمکتا ہوا فلسفہ ہاتھ لگا جو دنیا کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن کی طرح دمکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اگر بی۔ اے کرنے کے بعد میں کسی اعلیٰ عہدے پر مامور ہو جاتا تو یہ باتیں کہاں سے آتیں؟ اس میں شک نہیں کہ جو مصیبتیں اُٹھائیں اور اٹھا رہا ہوں اُن سے بچ جاتا اور ہر طرح کا آرام و اطمینان میسر ہوتا، لیکن وہ زندگی کس قدر مصنوعی ہوتی! اوسط طبقے کی خود غرضانہ زندگی! اوسط طبقے کے محدود خیالات! صدیوں کی دماغی غلامی کا بوجھ! آج کم از کم اتنا تو ہے کہ تاریکی اور جہالت کے اُس بوجھ سے میرا دماغ آزاد ہے مگر دوست! یہ روشن خیالی کس کام کی؟ محض خیالات سے کام نہیں بنتا۔ ہو تو تم بھی اُسی مشین کا ایک پرزہ جو تمہارے نزدیک ایک شکنجے سے کم نہیں۔ سماج کی بیڑیاں تو تمہارے پاؤں میں بھی پڑی ہوئی ہیں۔ ہاں، سچ ہے۔ مگر میں ان بیڑیوں کو کیسے توڑ سکتا ہوں؟ یہ ظفر! یہ شفقت! یہ اجمل! اور یہ رضیہ یہ بے ماں باپ کے بچے!"

اُس کے خیالات رک گئے۔ سات سال پہلے کا ایک منظر متحرک اور ناطق تصاویر کی طرح اُسکے سامنے آگیا:۔

"میرے لال!"

"ہاں اماں!"

"میرے بچے!"

"کہیے اماں!"

"بیٹا! تم شادی کر لینا۔ تمہارا جی بہلے گا"
"ہاں اماں۔ آپ خاموش رہیئے۔ ڈاکٹر نے منع کیا ہے بات کرنے کو"
"تمہارے باپ تو اٹھ گئے" اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں "اب تمہارا اِس دنیا میں کون ہے!"
"اماں! ....." وہ کچھ کہنا چاہتا ہے مگر نہیں کہہ سکتا۔
"او بیٹا! ان بچوں کو آپا کے سپرد کر دینا۔ اپنی خالہ کے پاس رہیں گے" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔
"آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہو جائیگی۔ روئیے نہیں" وہ بمشکل آنسو ضبط کرتے ہوئے کہتا ہے۔
"رضیہ اتنی چھوٹی ہے۔ اُسکو کون پالے گا" یہ کہہ کر وہ اور بھی زیادہ رونے لگتی ہے۔

....

....

وہ اس سات سال پرانے منظر کو دیکھکر تڑپ اُٹھا۔ اُس سال آنکھیں آنسوؤں میں تیرنے لگیں۔ منظر دھندلا ہو گیا۔ اور آہستہ آہستہ ماضی کی تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ اُس کے خیالات کا چشمہ پھر بہ نکلا۔
"رضیہ بہت چھوٹی ہے۔ اور اب وہ دس سال کی ہو گئی ہے۔ اُسکو اسکول میں داخل کرانا ہو گا۔ آجکل لڑکیوں کو تعلیم دلانا کتنا ضروری ہے! اور نہ دلانا کتنا بڑا ظلم ہے! میں اُسکو ہائی اسکول تک پڑھاؤنگا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ وہ لکھنے

پڑھنے کی کتنی شوقین ہے! لڑکیاں عام طور پر سبھی ایسی ہوتی ہیں۔ یہ شوق تو لڑکے
ہی ہوتے ہیں۔ ظفر! اتنا نالائق بھی کوئی کیا ہوگا! ہوش ہی نہیں کسی بات کا۔ کچھ سوچتے
سمجھتے ہی نہیں۔ دماغ سے کام لینے کی قسم کھا رکھی ہے۔ ارے بھئی! کبھی تو غور کر لیا
کرو اپنی حالت پر! اتنی بھی بےحسی کس کام کی! انہیں کی خاطر آج میں اڑتیس روپے
پانچ آنے کی نوکری کرنے پر مجبور ہوں۔ میں نے اپنی آزادی کا گلا گھونٹ دیا ہے۔
کیسی مصیبت ہے! لوگ مر جاتے ہیں اور دوسروں کے لئے عذاب چھوڑ جاتے ہیں۔ آخر
کیا حق ہے۔ آپ کو بچے پیدا کرنے کا اگر آپ انکی مناسب تربیت اور پرورش کا
انتظام نہیں کر سکتے؟ افسر مال تھے صاحب! بارہ سو روپے تنخواہ پاتے تھے! اور
بچے؟ بچے سوکھی روٹیاں کھا کر گزارا کرتے ہیں۔ لعنت ہے تمہارے اوپر! مگر یار
موت کی کس کو خبر ہوتی ہے؟ اگر کوئی چوالیس سال کی عمر میں ناگہانی مر جائے اور اپنی
اولاد کو بے آسرا چھوڑ جائے تو اسکو الزام دینا کہاں تک درست ہے؟ اس کا
اس میں کیا قصور ہے؟ پھر کس کا قصور ہے؟ قصور کسی کا ہو، یہ بات ہے نہایت
خوفناک کہ والدین کے مرنے کے بعد بچوں کی اس حد تک بربادی کا امکان ہے۔ اور
مجھے بھی تو موت آ سکتی ہے۔ میں بھی تو مرگِ ناگہاں کا شکار ہو سکتا ہوں۔ اگر آج
میں نہ ہوں تو کیا یہ بچے در در بھیک نہ مانگتے پھریں؟ کیا رضیہ یتیم خانے میں
داخل نہ کرا دی جائے؟ یا کسی امیر گھرانے میں جھاڑو دینے اور برتن مانجھنے پر نوکر نہ
رکھ لی جائے؟ یہ کم بخت ظفر! یہ تو کسی مصرف کا بھی نہیں ہے۔ بالکل ہی نکما ہے
جی چاہتا ہے ایک دن ایسی ٹھکائی کر دوں کہ عمر بھر یاد کرے۔ مگر بچوں کو مارنا کیسی
وحشیانہ حرکت ہے! میں نے آج تک ان بچوں کو نہیں مارا۔ والدین کو مرے ہوئے

سات آٹھ سال ہو گئے۔ اس مدت میں میں نے کبھی ان پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ درندے ہیں وہ لوگ جو بچوں کو مارتے ہیں۔ والد صاحب!۔۔۔۔"

اس کے حافظے نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اپنے پوشیدہ خزانے سے ایک ہولناک منظر نکالکر پیش کیا:۔

وہ دروازے کے باہر کھڑا ہے اور خوف کے مارے تھر تھر کانپ رہا ہے۔ دبلا پتلا مخنی سا لڑکا! باپ ڈیوڑھی میں ہے اور ہاتھ میں ایک بید لئے ہوئے ہے۔

"ادھر آ!" باپ چیخکر کہتا ہے۔

اسکے بدن میں جیسے جان ہی نہیں ہے۔ آگے بڑھنے کے لئے پاؤں اُٹھتے ہی نہیں۔

"پلا نہیں!" باپ پھر چیختا ہے۔

وہ چیونٹی کی چال سے آگے کو سرکتا ہے۔ گویا ایک ملزم ہے جو پھانسی پر لٹکایا جانے والا ہے۔

"کدھر گیا تھا؟"

اور قبل اسکے کہ وہ کوئی جواب دے، بید جنبش میں آ جاتا ہے اور اُسکے جسم پر ضربوں کی بارش ہونے لگتی ہے۔

. . . .

. . . .

"آدمی تھوڑے سے تھا جانور تھا" اُس نے اپنے دل میں کہا "اور اگر چہ ماشاءاللہ تعلیمیافتہ تھے! مہذب تھے! اور ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے! اچھی! امیر تر دیک تو

نرے جاہل تھے۔ گھامڑ اور جنگلی! مر گئے مردود نہ فاتحہ نہ درود! کر گئے ہمارا ستیاناس۔
آج مجھ میں جتنی کمزوریاں پائی جاتی ہیں سب بچپن کی انہیں مصیبتوں کا نتیجہ ہیں۔
آئے دن کی جسمانی سزا ہر وقت کی گھڑکیاں اور ڈانٹ ڈپٹ، چوبیس گھنٹے ایک
خوف میں مبتلا رہنا۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو ایک بچے کے ذہن کو مفلوج کر دیتی ہیں
اس میں ایک شدید قسم کا احساس کمتری پیدا ہو جاتا ہے۔ آج میں اپنے اندر خود
اعتمادی کا شائبہ بھی نہیں پاتا۔ میرا دماغ آزادی کے ساتھ سوچنے کے قابل نہیں
ہے۔ میں جو کچھ سوچتا ہوں اُس کو ضبطِ تحریر میں لانے کی جرأت نہیں رکھتا۔ اگر
کبھی کچھ لکھتا بھی ہوں تو اُسے دوسروں کو دکھاتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ بڑے لوگوں
سے ملنے میں مجھے ایک جھجک محسوس ہوتی ہے یہ جانتے ہوئے کہ بڑے لوگ
بھی بالکل معمولی انسان ہوتے ہیں۔ یہ ساری کمزوریاں اُن سختیوں کا نتیجہ ہیں
جو میں نے بچپن میں باپ کے ہاتھوں برداشت کیں۔ انہیں کمزوریوں کی بدولت
میری زندگی برباد ہوئی ہے۔ یہ کمزوریاں مجھ میں نہ ہوتیں تو آج میں ایک بہتر
انسان ہوتا اور ہرگز اپنی ذہانت کو اڑتیس روپے پانچ آنے ماہوار پہ فروخت
نہ کرتا۔"

اُسے یکلخت اپنے اردگرد کی بڑھتی ہوئی تاریکی کا احساس ہوا۔ اُس نے
ہتھیلیوں سے آنکھوں کو ملا جنہیں تخیلات کا خمار بھر آیا تھا اور جو اندھیرے میں مسلسل گھورتے
رہنے کے باعث پتھرا سی گئی تھیں پھر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

چادر پائی پر گھڑی پڑی ہوئی تھی۔ اُسکو اُٹھایا۔ اُنھر خود بخود چابی پر گیا۔ چابی
گھومنے لگی۔ وہ گھڑی کو جلدی سے کان کے پاس لے گیا۔ اُسمیں سے ٹک ٹک کی

آواز آ رہی تھی۔
گویا بات صرف اسقدر تھی کہ وہ گھڑی ہیں چابی دینا بھول گیا تھا۔
وہ بے اختیار مسکرا پڑا۔ معلوم نہیں یہ مسکراہٹ اُس دلچسپ بھول پر
ایک لطیف طنز تھی یا بارہ آنے کی بچت پر دلی مسرت کا اظہار!

گرم کوٹ

راجندر سنگھ بیدی

میں نے دیکھا ہے۔ معراج الدین ٹیلر ماسٹر کی دوکان پہ بہت سے عمدہ عمدہ سوٹ آویزاں ہوتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر اکثر میرے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ میرا اپنا گرم کوٹ بالکل پھٹ گیا ہے۔ اور اس سال ہاتھ تنگ ہونے کے باوجود مجھے ایک نیا گرم کوٹ سلوا لینا چاہیئے۔ ٹیلر ماسٹر کی دوکان کے سامنے سے گزرنے یا محکمہ کی تفریح کلب میں جانے سے گریز کروں تو ممکن ہے مجھے گرم کوٹ کا خیال بھی نہ آئے۔ کیونکہ کلب میں جب سنتا سنگھ اور یزدانی کے کوٹوں کے نفیس ورسٹڈ War S[illegible] میرے مستند تخیل پہ تازیانہ لگاتے ہیں تو اپنے کوٹ کی بوسیدگی کو شدید طور پر محسوس کرنے لگ جاتا ہوں۔ یعنی وہ پہلے سے کہیں زیادہ پھٹ گیا ہے۔

بیوی بچوں کو پیٹ بھر روٹی کھلانے کے لئے مجھ سے معمولی کلرک کو اپنی بہت سی ضروریات ترک کرنی پڑتی ہیں۔ اور انہیں جگر تک پہنچتی ہوئی سردی سے بچانے کے لئے خود موٹا جھوٹا پہننا پڑتا ہے...... یہ گرم کوٹ میں نے پار سال دہلی دروازے سے باہر پرانے کوٹوں کی ایک دکان سے مول لیا تھا۔ کوٹوں کے

سوداگر نے پرانے کوٹوں کی سیکنڈ ہینڈ گانٹھیں کسی مرانجا مرانجا اینڈ کمپنی کراچی سے منگوائی تھیں۔ میرے کوٹ میں نقلی سلک کے استر سے بنی ہوئی اندرونی جیب کے نیچے مرانجا مرانجا اینڈ کو، کا لیبل لگا ہوا تھا۔ مگر کوٹ مجھے بہت سستا ملا۔ تھنگار دونے ایک یا سستا روئے یار بار......... اور میرا کوٹ ہمیشہ ہی پھٹا رہتا تھا۔

اسی دسمبر کی ایک شام کو تفریح کلب سے واپس آنے پر میں ارادتاً انارکلی میں سے گزرا۔ اس وقت میری جیب میں دس روپے کا نوٹ تھا۔ آٹا دال، ایندھن بجلی بیمہ کمپنی کے بل چکا دینے پر میرے پاس وہی دس کا نوٹ بچ رہا تھا..... جیب میں دام ہوں تو انارکلی میں سے گذرنا معیوب نہیں۔ اُس وقت اپنے آپ پر غصہ بھی نہیں آتا۔ بلکہ اپنی ذات کچھ بھلی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اس وقت انارکلی میں چاروں طرف سوٹ ہی سوٹ نظر آ رہے تھے اور ساڑھیاں، چند سال سے ہر نتھو خیرا سوٹ پہننے لگا ہے...... میں نے سنا ہے۔ گذشتہ چند سال میں کئی ٹن سونا ہمارے ملک سے باہر چلا گیا ہے...... شاید اسی لئے لوگ جسمانی زیبائش کا خیال بھی بہت رکھتے ہیں۔ نئے نئے سوٹ پہننا! ورنہ خوب شان سے رہنا ہمارے افلاس کا بدیہی ثبوت ہے۔ ورنہ جو لوگ سچ مچ امیر ہیں۔ ایسی شان و شوکت اور ظاہری تکلفات کی چنداں پروا نہیں کرتے۔

کپڑے کی دکان میں ورسٹڈ کے تھانوں کے تھان کھلے پڑے تھے۔ انہیں دیکھتے ہوئے میں نے کہا۔ کیا میں اس مہینے کے بچے ہوئے دس روپوں میں سے کوٹ کا کپڑا خرید کر بیوی بچوں کو بھوکا ماروں؟ لیکن کچھ عرصہ کے بعد میرے دل میں نئے کوٹ کے ناپاک خیال کا ردِ عمل شروع ہوا۔ میں اپنے پرانے گرم کوٹ کا

بٹن یکپڑ کر ان سے بل دینے لگا۔ چونکہ تیز تیز چلنے سے میرے جسم میں حرارت آگئی تھی اسلئے موسم کی سردی اور اس قسم کے خارجی اثرات میرے کوٹ خریدنے کے ارادے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے سے قاصر رہے۔ مجھے تو اسوقت اپنا دہ کوٹ بھی سراسر تکلف نظر آنے لگا۔

ایسا کیوں ہوا؟ میں نے کہا ہے جو شخص حقیقتاً امیر ہوں وہ ظاہری شان کی چنداں پروا نہیں کرتے۔ جو لوگ سچ مچ امیر ہوں۔ انہیں تو پھٹا ہوا کوٹ بلکہ قمیض بھی تکلف میں داخل سمجھنی چاہیئے تو کیا میں سچ مچ امیر تھا کہ......؟

میں نے گھبرا کر ذاتی تجزیہ چھوڑ دیا اور بہ مشکل دس کا نوٹ صحیح سلامت لئے گھر پہنچ گیا۔

شمی امیری بیوی امیری منتظر تھی۔

آٹا گوندھتے ہوئے اس نے آگ پھونکنی شروع کر دی ——— کم بخت منگل سنگھ نے اس دفعہ لکڑیاں گیلی بھیجی تھیں۔ آگ جلنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ زیادہ پھونکیں مارنے سے گیلی لکڑیوں میں سے اور بھی زیادہ دھواں اٹھا۔ شمی کی آنکھیں لال انگارہ ہو گئیں۔ اُن سے پانی بہنے لگا۔

"کمبخت کہیں کا...... منگل سنگھ" میں نے کہا " ان پُرنم آنکھوں کے لئے منگل سنگھ تو کیا میں تمام دُنیا سے جنگ کرنے پر آمادہ ہوں......"

بہت تگ و دو کے بعد لکڑیاں آہستہ آہستہ چٹخنے لگیں۔ آخر ان پُرنم آنکھوں کے پانی نے میرے غصے کی آگ بجھا دی...... شمی نے میرے شانہ پہ سر رکھا اور میرے پھٹے ہوئے گرم کوٹ میں پتلی پتلی اُنگلیاں داخل کرتی

ہوئی بولی۔

"اب تو یہ بالکل کام کا نہیں رہا۔"

"میں نے دھیمی سی آواز میں کہا۔" ہاں"۔

"سی دوں؟ ...... یہاں سے ......"

"سی دو۔ اگر کوئی ایک آدھ تار نکال کر رفو کر دو تو کیا کہنے ہیں۔"

"کوٹ کو اُلٹاتے ہوئے شمی بولی۔" استر کو تو موٹی ٹلڈیاں چاٹ رہی ہیں ...... نقلی ریشم کا ہے نا ...... یہ دیکھئے۔"

میں نے شمی سے اپنا کوٹ چھین لیا۔ اور کہا "مشین کے پاس بیٹھنے کی بجائے تم میرے پاس بیٹھو شمی ...... دیکھتی نہیں ہو دفتر سے آ رہا ہوں ...... یہ کام تم اُسوقت کر لینا جب میں سو جاؤں۔"

شمی مسکرانے لگی۔

وہ شمی کی مسکراہٹ اور میرا اچھا ہوا کوٹ!

شمی نے کوٹ کو خود ہی ایک طرف رکھ دیا۔ بولی۔ "میں خود بھی اس کوٹ کی مرمت کرتے کرتے تھک گئی ہوں ...... اسے مرمت کرنے میں اُس گیلے ایندھن کو جلانے کی طرح جان مارنی پڑتی ہے ...... آنکھیں دکھنے لگتی ہیں ...... آخر آپ اپنے کوٹ کے لئے کپڑا کیوں نہیں خرید تے"؟

میں کچھ دیر سوچتا رہا۔

یوں تو میں اپنے کوٹ کے لئے کپڑا خریدنا گناہ خیال کرتا تھا۔ مگر شمی کی آنکھیں! ...... ان آنکھوں کو تکلیف سے بچانے کے لئے میں سنگل سنگھ تو

کیا تمام دُنیا سے جنگ کرنے پر آمادہ ہو جاؤں۔ ورسٹڈ کے تھانوں کے تھان خریدلیں نئے گرم کوٹ کے لئے کپڑا خریدنے کا خیال دل میں پیدا ہوا ہی تھا۔ کہ پشپامنی بھاگتی ہوئی کہیں سے آگئی۔ آتے ہی برآمدے میں ناچنے اور گانے لگی۔ اُسکی حرکات کتھا کلی مدرا سے زیادہ کیف انگیز تھی۔

مجھے دیکھتے ہوئے پُشپامنی نے اپنا ناچ اور گانا ختم کر دیا۔ بولی۔

"بابو جی آپ آگئے؟ آج بڑی بہن جی (اُستانی) نے کہا تھا میز پوش کے لئے دو سوتی لانا۔ اور گرم کپڑے پر کاٹ سکھائی جائے گی۔ گُڑیا ماپ کے لئے اور گرم کپڑا ......"

چونکہ اس وقت میرے گرم کوٹ خریدنے کی بات ہو رہی تھی۔ شمی نے زور سے ایک چپت اُسکے منہ پر لگائی اور بولی۔

"اِس جنم جلی کو ہر وقت...... ہر وقت کچھ نہ کچھ خریدنا ہی ہوتا ہے۔ مشکل سے انہیں کوٹ سلوانے پر راضی کر رہی ہوں......"

وہ پشپامنی کا رونا اور میرا اپنا کوٹ!

میں نے خلافِ عادت اُونچی آواز سے کہا "شمی"!

شمی کانپ گئی۔ میں نے غصّے سے آنکھیں لال کرتے ہوئے کہا "میرے اس کوٹ کی مرمت کر دو...... ابھی...... کسی طرح کرو...... ایسے جیسے رو بیٹھ کر منگل سنگھ کی گیلی لکڑیاں جلا لیتی ہو...... تمہاری آنکھیں ہاں یاد آیا...... دیکھو تو پشپامنی کیسے رو رہی ہے۔ پُپّی بیٹیا ادھر آؤ نا...... ادھر آؤ میری بچی۔ کیا کہا تھا تم نے؟ بولو تو...... دو سوتی؟ گُڑیا ماپ کے لئے اور

کاٹ سیکھنے کو گرم کپڑا ؟ ——— بچو ننھا بھی تو ٹرائسکل کا راگ الا پتا اور غبارے کے لئے مچلتا سو گیا ہوگا۔ اُسے غبارہ نہ لے دو گی تو میرا کوٹ سِل جائے گا۔ ہے نا؟ ..... کتنا رویا ہوگا بے چارہ ..... شمی! کہاں ہے بچو؟

"جی سو رہا ہے ..... شمی نے سہمے ہوئے جواب دیا۔

"اگر میرے گرم کوٹ کے لئے تم ان معصوموں سے ایسا سلوک کرو گی تو مجھے تمہاری آنکھوں کی پرواہی کیا ہے"؟ پھر میں نے دل میں کہا۔ کیا یہ سب کچھ میرے گرم کوٹ کے لئے ہو رہا ہے۔ شمی سچی ہے یا میں سچا ہوں۔ پہلے میں نے کہا ——— دونوں ..... مگر جو سچا ہوتا ہے۔ اُس کا ہاتھ ہمیشہ اُوپر رہتا ہے۔ میں نے خود ہی ڈبتے ہوئے کہا۔

"تم خود بھی تو اُس دن کافوری رنگ کے مینا کار کانٹوں کے لئے کہہ رہی تھیں ....."

ہاں ..... جی ...... کہہ تو رہی تھی مگر ......"

مگر ..... مگر اس وقت تو مجھے اپنے گرم کوٹ کی جیب میں دس روپے کا نوٹ ایک بڑا بھاری خزانہ معلوم ہو رہا تھا۔!

دوسرے دن شمی نے میرا کوٹ کہنیوں پر سے رفو کر دیا۔ ایک جگہ جہاں پر سے کپڑا بالکل اُڑ گیا تھا۔ صفائی اور احتیاط سے کام لینے کے باوجود سلائی پہ بدنما سلوٹیں پڑنے لگیں۔ اسوقت معراجدین ٹیلر ماسٹر کی دکان کی دکان میرے ذہن میں گھومنے لگی۔ اور پھر میرے تخیل کی پختہ کاری اکثر مجھے مصیبت میں ڈالے رکھتی

ہے۔ میں نے دل میں کہا۔ "معراج الدین کی دوکان پر ایسے سوٹ بھی تو ہوتے ہیں۔ جن پر سلائی سمیت سو روپے سے بھی زیادہ لاگت آتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ میں ایک معمولی کلرک ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی دکان میں لٹکے ہوئے سوٹوں کا تصوّر کرنا عبث ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عبث۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

مجھے فرصت میں پاکر شمی میرے پاس آبیٹھی۔ اور ہم دونوں خریدی جانے والی چیزوں کی فہرست بنانے لگے۔ ۔ ۔ ۔ جب ماں باپ اکٹھے ہوتے ہیں تو بچے بھی آجاتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پُشپا منی اور بچو آ گئے۔ آندھی اور بارش کی طرح شور مچاتے ہوئے۔

شمی کو خوش کرنے کے لئے نہیں بلکہ یوں ہی میں نے کافوری رنگ کے مینا کار کانٹے سب سے پہلے لکھے۔ اچانک سوئی کی طرف میری نظر اُٹھی۔ چُولھے میں لکڑیاں دھڑ دھڑ جل رہی تھیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ادھر شمی کی آنکھیں بھی دو چمکتے ہوئے ستاروں کی طرح روشن تھیں۔ معلوم ہوا کہ منگل سنگھ گیلی لکڑیاں واپس لے گیا ہے۔

"وہ شہتوت کے ڈنڈے جل رہے ہیں۔ اور رکھو کھا"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شمی نے کہا۔

"اور اوپلے؟"

"جی ہاں، اوپلے بھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

"منگل سنگھ دیوتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شاید میں بھی عنقریب گرم کوٹ کے لئے اچھا سا ورسٹڈ خرید لوں۔ تاکہ تمہاری آنکھیں یونہی چمکتی رہیں انہیں تکلیف نہ ہو ـــــــ اس ماہ کی تنخواہ میں تو گنجائش نہیں۔ ۔ ۔ ۔ لگلے ماہ ضرور۔ ۔ ۔ ۔

ضرور........"

"جی ہاں، جب سردی گذر جائے گی......"

پشپامنی نے کئی چیزیں لکھائیں۔ دو سوتی، گنیا باپ کے لئے گرم بلینرز بسنر رنگ کا ایک گز مربع، ڈی ایم سی کے گولے، گوٹے کی مغزی ——— اور رامرتیاں اور بہت سے گلاب جامن...... موتی نے سب کچھ ہی تو لکھوا دیا۔ مجھے دائمی قبض تھی۔ میں چاہتا تھا کہ یونانی دواخانہ سے اطریفل زمانی کا ایک ڈبا بھی لا رکھوں دودھ کے ساتھ تھوڑا سا پی کر سو جایا کرونگا۔ مگر موتی پُشپا نے اُس کے لئے گنجائش ہی کہاں رکھی تھی۔ اور جب پُشپامنی نے کہا "گلاب جامن" تو اُسکے منہ میں پانی بھر آیا۔ میں نے کہا سب سے ضروری چیز تو یہی ہے...... بس شہر سے واپس آنے پر میں گلاب جامن وہاں چھپا دونگا۔ جہاں سبز ڈھیول میں بار جمعدار اپنا دودھ کا کلسہ رکھدیا کرتا ہے اور پشپامنی سے کہونگا کہ میں تو لانا ہی بھول گیا...... تمہارے لئے گلاب جامن...... اور ہوا...... اُسوقت اُسکے منہ میں پھر پانی بھر آئے گا۔ اور گلاب جامن نہ پاکر اُسکی عجیب کیفیت ہو گی۔ پھر میں نے سوچا بچو بھی تو صبح سے غبارے اور ٹرائسکل کے لئے ضد کر رہا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ اپنے آپ سے سوال کیا "اطریفل زمانی"؟ شمی بچوں کو پچکارتے ہوئے کہہ رہی تھی "بچو بیٹی کو ٹرائسکل لے دونگی۔ اگلے مہینے...... بچو بیٹی سارا دن چلایا کرے گی۔ ٹرائسکل...... پوپی مُنا کچھ نہیں لے گا!

بچو چلایا کرے گی"۔ اور پوپی مُنّا نہیں لے گا"۔

——— اور میں نے شمی کی آنکھوں کی قسم کھائی۔ کہ جب تک ٹرائسکل کے لئے چھ

سات روپے جیب میں نہ ہوں۔ میں نیلے گنبد کے بازار سے نہیں گذروں گا۔ اس لئے کہ دام نہ ہونے کی صورت میں نیلے گنبد سے گذرنا بہت معیوب ہے خواہ مخواہ اپنے آپ پر غصہ آئے گا۔ اپنی ذات سے نفرت پیدا ہو گی۔

اُس وقت شمی بلجیمی آئینے کی بیضوی ٹکڑی کے سامنے اپنے کافوری سپید سوٹ میں کھڑی تھی۔ میں چپکے سے اُسکے پیچھے جا کھڑا ہوا اور کہنے لگا "میں بتاؤں تم اسوقت کیا سوچ رہی ہو؟"

"بتاؤ تو جانوں ......"

"تم کہہ رہی ہو۔ کافوری سپید سوٹ کے ساتھ وہ کافوری رنگ کے مینا کار کانٹے پہنکر ضلعدار کی بیوی کے ہاں جاؤں تو وہ دنگ رہ جائے ......"

"نہیں تو" شمی نے ہنستے ہوئے کہا "آپ میری آنکھوں کی تعریف کرتے ہیں میں نے کہا دیکھوں تو ان میں کیا دھرا ہے ..... سچی بات تو یہ ہے کہ اگر آپ سچ مچ میری آنکھوں کے مداح ہوتے۔ تو کبھی کا گوم ......"

میں نے شمی کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ میری تمام خوشی بے بسی میں بدل گئی۔ میں نے آہستہ سے کہا "بس ...... ادھر دیکھو ...... اگلے مہینے ——

ضرور خرید دوں گا ......"

"جی ہاں، جیب سردی ......"

—— پھر میں اپنی اس حسین دُنیا کو جس کی تخلیق پہ محض دس روپے صرف ہوتے تھے۔ تصور میں لیساتے بازار چلا گیا۔

میرے سوا انار کلی میں سے گذرنے والے ہر ذی عزت آدمی نے گرم سوٹ پہن رکھا تھا۔ لاہور کے ایک لحیم و شحیم جنٹلمین کی گہرے دن نکٹائی اور مکلّف کالر کے سبب میرے چھوٹے بھائی کے پالتو دبلی گئیّے "ٹائیگر" کی گردن کی طرح اکڑی ہوئی تھی۔ میں نے ان سوٹوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"لوگ سچ مچ بہت مفلس ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔ اس مہینے نہ معلوم کتنا سونا چاندی ہمارے ملک سے باہر چلا گیا ہے" کانٹوں کی دکان پر میں نے کئی جوڑیاں کانٹے دیکھے۔ اپنی تخیّل کی پختہ کاری سے میں شمی کی کافوری سپید سوٹ میں ملبوس ذہنی تصویر کو کانٹے پہنا کر پسند یا ناپسند کر لیتا۔۔۔۔ کافوری سپید سوٹ۔۔۔ کافوری مینا کار کانٹے۔۔۔۔ کثرتِ اقسام کے باعث ان میں سے میں ایک بھی منتخب نہ کر سکا۔

اُس وقت بازار میں مجھے بیزدانی مل گیا۔ وہ تفریح کلب سے جو در اصل برج کلب تھی۔ پندرہ روپے جیت کر آ رہا تھا۔ اُسکے چہرے پر اگر سرخی اور بشاشت کی لہریں دکھائی دیتی تھیں۔ تو کچھ تعجب کی بات نہ تھی۔ میں ایک ہاتھ سے اپنی جیب کی سلوٹوں کو چھپانے لگا۔ نچلی بائیں جیب پر ایک روپے کے برابر کوٹ ملتے ہوئے رنگ کا پیوند بہت ہی ناموزوں دکھائی دے رہا تھا۔۔۔۔ میں اُسے بھی ایک ہاتھ سے چھپاتا رہا۔ پھر میں نے دل میں کہا۔ کیا عجب بیزدانی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھنے سے پہلے میری جیب پر کی سلوٹیں اور وہ روپے برابر کوٹ کے رنگ کا پیوند دیکھ لیا ہو۔۔۔۔ اس کا بھی ردِّ عمل شروع ہوا اور میں نے دلیری سے کہا۔

مجھے کیا پروا ہے ۔۔۔۔۔ یزدانی مجھے کونسی تفصیلی بخشش دیگا۔ اور اسمیں بات ہی کیا ہے۔ یزدانی اور سنتا سنگھ نے بارہا مجھ سے کہا ہے۔ کہ وہ رفعتِ ذہنی کی زیادہ پرواہ کرتے ہیں اور رفعتِ ذہنی کی کم!

مجھ سے کوئی پوچھے۔ میں ورسٹڈ کی زیادہ پروا کرتا ہوں۔ اور رفعتِ ذہنی کی کم!

یزدانی رخصت ہوا اور جب تک وہ نظر سے اوجھل نہ ہو گیا میں غور سے اُسکے کوٹ کے نفیس ورسٹڈ کو پُشت کی جانب سے دیکھتا رہا۔

پھر میں نے سوچا کہ سب سے پہلے مجھے پُشپا منی کے لئے گلاب جامن اور اپنا برش خریدنی چاہئیں۔ کہیں واپسی پر سچ مچ بھول ہی نہ جاؤں۔ گھر پہنچکر انہیں چھپانے سے خوب تماشا رہیگا۔ مٹھائی کی دُکان پر کھولتے ہوئے روغن میں کچوریاں خوب پھول رہی تھیں۔ میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ اسطرح جیسے گلاب جامن کے تخیل سے پُشپا منی کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ قبض اور اطریفل زمانی کے باوجود میں سفید پتھر کی میز پر کہنیاں ٹکا کر بہت رغبت سے کچوریاں کھانے لگا۔۔۔۔۔۔

ہاتھ دھونے کے بعد جب پیسوں کے لئے جیب ٹٹولی تو اسمیں کچھ بھی نہ تھا۔ دس کا نوٹ کہیں گر گیا تھا!

کوٹ کی اندرونی جیب میں ایک بڑا سوراخ ہو رہا تھا۔ نقلی ریشم کو مکڑیاں چاٹ گئی تھیں۔ جیب میں ہاتھ ڈالنے پر اُسجگہ جہاں مرانجا مرانجا نیڈکو کا لیبل لگا ہوا تھا۔ میرا ہاتھ باہر نکل آیا۔ نوٹ وہیں سے باہر گر گیا ہوگا۔

ایک لمحہ میں یوں دکھائی دینے لگا جیسے کوئی بھولی سی بھیڑ اپنی خوبصورت پشم اُتر جانے پر دکھائی دینے لگتی ہے۔

حلوائی بھانپ گیا اور خود ہی بولا۔ کوئی بات نہیں بابو جی۔ ... پیسے کل آجائیں گے۔"

میں کچھ نہ بولا ... کچھ بول ہی نہ سکا۔

صرف اظہارِ تشکر کے لئے میں نے حلوائی کی طرف دیکھا۔ حلوائی کے پاس ہی گلاب جامن چاشنی میں ڈوبے پڑے تھے۔ روغن میں پھولتی ہوئی کچوریوں کے دھوئیں میں اسے آتشیں سُرخ امرتیاں جگہ پر داغ لگا رہی تھیں ... اور ذہن میں پُشپامنی کی دھندلی سی تصویر پھر گئی۔

میں وہاں سے بادامی باغ کی طرف چل دیا اور آدھ پون گھنٹہ کے قریب بادامی باغ کی ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اس عرصہ میں جنکشن کی طرف سے ایک مال گاڑی آئی۔ اس کے پانچ منٹ بعد ایک شنٹ کرتا ہوا انجن جس میں سے دُھکتے ہوئے سُرخ کوئلے لائن پر گر رہے تھے ___ مگر اُس وقت قریب ہی کی سالٹ ریفائنری میں سے بہت سے مزدور اوور ٹائم لگا کر واپس لوٹ رہے تھے ... میں لائن کے ساتھ ساتھ دریا کے پُل کی طرف چلا گیا۔ چاندنی رات میں سردی کے باوجود کالج کے چند منچلے نوجوان کشتی چلا رہے تھے۔

" قدرت نے عجیب سزا دی ہے مجھے" میں نے کہا۔ پُشپامنی کے لئے گوٹے کی مغزی، دوسوتی، گلاب جامن اور شمی کے لئے کافوری مینا کار کانٹے خریدنے سے بھی بڑھ کر کوئی گناہ سرزد ہو سکتا ہے۔ کس بے رحمی اور بے دردی سے میری

ایک حسین مگر بہت سستی دنیا برباد کر دی گئی ہے ..... جی تو چاہتا ہے کہ میں بھی قدرت کا ایک شاہکار توڑ پھوڑ کے رکھ دوں۔

مگر پانی میں کشتی ران لڑکا کہہ رہا تھا۔

اس موسم میں تو راوی کا پانی گھٹنے گھٹنے سے زیادہ کہیں نہیں ہوتا۔

" سارا پانی تو اوپر سے اپر باری دواب لے لیتی ہے ...... اور یوں بھی آج کل پہاڑوں پر برف نہیں پگھلتی ...... دوسرے نے کہا۔

میں ناچار گھر کی طرف لوٹا۔ اور نہایت بے دلی سے زنجیر ہلائی۔ میری خواہش اور اندازے کے مطابق پتّا، منی اور بچو ننّھا بہت دیر ہوئی دہلیز پر سے اُٹھ کر بستروں میں جا سوئے تھے۔ شمی چولھے کے پاس شہتوت کے نیم جلے کوئلوں کو تاپتی ہوئی کئی مرتبہ اونگھی اور کئی مرتبہ چونکی تھی۔ وہ مجھے خالی ہاتھ دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ اُس کے سامنے میں نے چور جیب کے اندر ہاتھ ڈالا اور لیبل کے نیچے سے نکال لیا۔ شمی سب کچھ سمجھ گئی۔ وہ کچھ نہ بولی ..... کچھ بول ہی نہ سکی۔ میں نے کوٹ کھونٹی پر لٹکا دیا۔ میرے پاس ہی دیوار کا سہارا لیکر شمی بیٹھ گئی اور ہم دونوں سوتے ہوئے بچوں اور کھونٹی پر لٹکے ہوئے گرم کوٹ کو دیکھنے لگے۔

اگر شمی نے میرا انتظار کئے بغیر وہ کافوری سوٹ بدل دیا ہوتا تو شاید میری حالت اتنی متغیر نہ ہوتی۔

نیم دانی اور سنتا سنگھ تفریح کلب میں برِج کھیل رہے تھے۔ انہوں نے دو دو تین تین گھونٹ پی بھی رکھی تھی۔ مجھ سے بھی پینے کے لئے اصرار کرنے لگے۔ مگر میں نے انکار کر دیا۔

اس لئے کہ میری جیب میں دام نہ تھے۔ سنتا سنگھ نے اپنی طرف سے ایک آدھ گھونٹ زبردستی مجھے بھی پلا دیا۔ شاید اسلئے کہ وہ جان گئے تھے کہ اسکے پاس پیسے نہیں ہیں۔ یا شاید اسلئے کہ وہ رفعت ذہنی کی ورسٹڈ سے زیادہ بڑا کرتے تھے۔

اگر گھر میں اُس دن شمی کو وہی کافوری سپید سوٹ پہنے ہوئے دیکھ نہ آتا تو شاید پریل میں قسمت آزمائی کرنے کو میرا جی بھی نہ چاہتا۔ میں نے کہا کاش! میری جیب میں ایک دو روپے ہوتے تو کیا عجب تھا کہ میں بہت سے روپے بنا لیتا ——

مگر میری جیب میں کل پونے چار آنے تھے۔

بزدانی اور سنتا سنگھ نہایت عمدہ ورسٹڈ کے سوٹ پہنے نیک عالم کلب کے سکریٹری سے جھگڑ رہے تھے نیک عالم کہہ رہا تھا کہ وہ تفریح کلب کو پریل کلب اور بار بنتے ہوئے کبھی نہیں دیکھ سکتا۔ اُسوقت میں نے ایک مایوس آدمی کے مخصوص انداز میں جیب میں ہاتھ ڈالا اور کہا "بیوی بچوں کے لئے کچھ خریدنا، قدرت کے نزدیک گناہ ہے۔ اس حساب سے پریل کھیلنے کے لئے تو اُسے اپنی گرہ سے دام دے دینے چاہئیں۔ ہی ہی...... غی غی......"

اندرونی کیسہ...... بائیں نچلی جیب...... کوٹ میں پشت کی طرف مجھے کوئی کاغذ سرکتا ہوا معلوم ہوا۔ اُسے سرکاتے ہوئے...... میں نے دائیں جیب کے سُوراخ کے نزدیک جا نکالا۔

—— وہ دس روپے کا نوٹ تھا۔ جو اُس دن اندرونی جیب کی تہ کے سوراخ میں سے گذر کر کوٹ کے اندر ہی اندر گم ہو گیا تھا!

اُس دن میں نے قدرت سے انتقام لیا۔ میں اُسکی خواہش کے مطابق پیپل وِریل نہ کھیلا۔ نوٹ کو مٹھی میں دبائے گھر کی طرف بھاگا۔ اگر اُسدن میرا انتظار کئے بغیر شمی نے وہ کافوری سُوٹ بدل دیا ہوتا۔ تو میں خوشی سے یوں دیوانہ کبھی نہ ہوتا۔

ہاں، پھر چلنے لگا وہی تخیل کا دور۔ گویا ایک حسین سے حسین دنیا کی تخلیق میں دس روپے سے اوپر ایک دمڑی بھی خرچ نہیں آتی جب میں بہت سی چیزوں کی بہت فہرست بنا رہا تھا۔ شمی نے میرے ہاتھ سے کاغذ چھین کر پُرزے پُرزے کر دیا اور بولی۔

"اتنے نقشے مت بنایئے..... پھر نوٹ کو نظر لگ جائے گی"

"شمی ٹھیک کہتی ہے" میں نے سوچتے ہوئے کہا "نہ تخیل اتنا رنگین ہو اور نہ محرومی سے اتنا دُکھ پہنچے"

پھر میں نے کہا "ایک بات ہے شمی! مجھے ڈر ہے کہ نوٹ پھر کہیں مجھ سے گم نہ ہو جائے..... تمہاری کھیمو (دیڑوسن) بازار جا رہی ہے۔ اُسکے ساتھ جا کر تم یہ سب چیزیں خود ہی خرید لاؤ..... کافوری مینا کار کانٹے..... ڈی ایم سی کے گولے، مغزی ..... اور دیکھو پوپی منّا کے لئے گلاب جامن ضرور لانا..... ضرور....."

شمی نے کھیمو کے ساتھ جانا منظور کر لیا۔ اور اُس شام شمی نے کشمیرے کا ایک نہایت عمدہ سوٹ پہنا۔

بچوں کے شور و غوغا سے میری طبیعت بہت گھبراتی ہے۔ مگر اسدن میں عرصہ تک بچّو ننھے کو اُس کی ماں کی غیر حاضری میں بہلاتا رہا۔ نہ رسوئی سے ابندھن کی کوٹھی۔ غسلخانے، اور چھت پر ـــــ سب جگہ اُسے ڈھونڈتا پھرا میں نے اُسے پچکارتے ہوئے کہا۔

وہ ٹرائسکل لینے گئی ہے...... نہیں جانے دو۔ ٹرائسکل گندی چیز ہوتی ہے اخ
تھو... غبارہ لائے گی، بی بی تمہارے لئے بہت خوبصورت غبارہ....."
بچو، بیٹی نے میرے سامنے تھوک دیا۔ بولی" اے.... امی.... گندی"
میں نے کہا "کوئی دیکھے تو..... کیسا بیٹیوں سا بیٹا ہے۔
پشپامنی کو بھی میں نے گود میں لے لیا اور کہا۔ پوپی متا.... آج گلاب جامن
جی بھر کر کھائے گا نا!....."
اسکے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ گود سے اتر پڑی، بولی" ایسا معلوم ہوتا ہے
.... جیسے ایک بڑا سا گلاب جامن کھا رہی ہوں"
بچو روتا رہا۔ پشپامنی کتھا کلی مدرا سے زیادہ حسین ناچ برآمدے میں ناچتی رہی۔
مجھے میرے تخیل کی پرواز سے کون روک سکتا تھا۔ کہیں میرے تخیل کے قلعے
زمین پر نہ آ رہیں۔ اسی ڈر سے تو میں نے شمی کو بازار بھیجا تھا۔ میں سوچ رہا تھا۔
شمی اب گھوڑے ہسپتال کے قریب پہنچ چکی ہوگی.... اب کالج روڈ کی نکڑ پر ہوگی
.....اب گندے انجن کے پاس.....
اور ایک نہایت دھیمے انداز سے زنجیر ہلی۔
شمی سچ مچ آگئی تھی۔ دروازے پر۔
شمی اندر آتے ہوئے بولی "میں نے دو روپے کھیمو سے اُدھار لے کر بھی
خرچ کر ڈالے ہیں"
"کوئی بات نہیں" میں نے کہا۔

مگر شمی کے ہاتھ میں ایک بنڈل کے سوا کچھ نہ تھا۔ اُس نے میز پر بنڈل کھولا

——— وہ میرے کوٹ کے لئے بہت نفیس ورسٹڈ تھا!

پُشپا منی نے کہا "بی بی! میرے گلاب جامن۔۔۔۔"

شمی نے زور سے ایک چپت اُسکے منہ پہ لگادی!

تحریر نمود محمد بشیر رشید وفقہ